محمد اظہار الحق کی کالم نگاری کی فکری جہات کا تنقیدی مطالعہ

(تلخ نوائی کے منتخب کالموں کے حوالے سے)

مقالہ برائے ایم۔فل (اردو)

مقالہ نگار:

محمد حنیف

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

جنوری ۲۰۱۹ء

محمد اظہار الحق کی کالم نگاری کی فکری جہات کا تنقیدی مطالعہ

(تلخ نوائی کے منتخب کالموں کے حوالے سے)

مقالہ نگار:

محمد حنیف

یہ مقالہ

ایم۔فل (اردو)

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا۔

فیکلٹی آف لینگویجز

(اردو زبان و ادب)

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

جنوری ۲۰۱۹ء

مقالے کا دفاع اور منظوری کا فارم

زیرِ دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انہوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے، وہ مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں اور فیکلٹی آف لینگویجز کو اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: محمد اظہار الحق کی کالم نگاری کی فکری جہات کا تنقیدی مطالعہ (تلخ نوائی کے منتخب کالموں کے حوالے سے)

پیش کار: محمد حنیف رجسٹریشن نمبر: 1321/M/U/S17

ماسٹر آف فلاسفی

شعبہ: زبان و ادب

ڈاکٹر عنبرین تبسم شاکر جان

نگران مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر محمد سفیر اعوان

ڈین فیکلٹی آف لینگویجز

بریگیڈیئر محمد ابراہیم

ڈائریکٹر جنرل

تاریخ

اقرارنامہ

میں، محمد حنیف حلفیہ بیان کرتا ہوں کہ اس مقالے میں پیش کیا گیا کام میرا ذاتی ہے اور نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز اسلام آباد کے ایم فل سکالر کی حیثیت سے ڈاکٹر عنبرین تبسم شاکر جان کی نگرانی میں کیا گیا ہے۔ میں نے یہ کام کسی اور یونیورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا ہے اور نہ آئندہ کروں گا۔

_____

محمد حنیف

مقالہ نگار

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

جنوری ۲۰۱۹ء

فہرست ابواب

عنوان		صفحہ نمبر
مقالے کا دفاع اور منظوری کا فارم		III
اقرار نامہ		IV
فہرست ابواب		V
مقالے کا دائرہ کار		VII
Abstract		IX
مقالے کا مقصد		XI
اظہارِ تشکّر		XI
باب اول	محمد اظہار الحق بحیثیتِ اردو کالم نگار	۱
الف)۔ موضوع کا تعارف، بیان مسئلہ، تحدید، مقاصد		۱
ب)۔ کالم نگاری کیا ہے؟		۴
ج)۔ کالم کا لفظی و لغوی معنی		۵
د)۔ صحافتی و اصطلاحی معنی		۶
ر)۔ اردو کالم نگاری کی مختصر روایت		۱۴
ز)۔ محمد اظہار الحق تعارف اور ادبی زندگی کا آغاز		۳۱
س)۔ محمد اظہار الحق کی اردو کالم نگاری		۳۴
حوالہ جات		۳۸

باب دوم محمد اظہار الحق کے کالموں میں ادبی، سیاسی، تاریخی اور مذہبی جہات کا تنقیدی مطالعہ ۴۰

الف)۔ زبان و ادب ۴۰

ب)۔ ادب اور صحافت کا تعلق ۴۳

ج)۔ سیاست و عدل ۴۹

د)۔ تاریخ و تمدن ۵۸

ر)۔ دین و مذہب ۶۹

حوالہ جات ۷۷

باب سوم محمد اظہار الحق کے کالموں میں سماجی، ثقافتی اور معاشی جہات کا تنقیدی مطالعہ ۸۱

الف)۔ تہذیبی، سماجی اور ثقافتی رجحانات ۸۱

ب)۔ تعلیم، کھیل اور مفادِ عامہ ۹۲

ج)۔ سائنس اور سیاحت ۱۰۱

د)۔ معاشی اور سماجی مسائل ۱۰۷

حوالہ جات ۱۲۲

باب چہارم مجموعی جائزہ ۱۲۶

نتائج ۱۵۲

سفارشات ۱۵۳

کتابیات ۱۵۴

اشاریہ ۱۵۸

مقالے کا دائرہ کار

میں نے اپنی تحقیق بعنوان "محمد اظہار الحق کی کالم نگاری کی فکری جہات کا تنقیدی مطالعہ (تلخ نوائی کے منتخب کالموں کے حوالے سے) کے لیے معروف اردو کالم نگار محمد اظہار الحق کے کالموں کے مجموعے "تلخ نوائی" کا انتخاب کیا ہے۔ محمد اظہار الحق کے کالموں کا یہ پہلا مجموعہ "تلخ نوائی" المیزان پبلشرز الکریم مارکیٹ اردو بازار لاہور سے ۲۰۱۶ء میں چھپا ہے۔ اِس میں کل اٹھتر کالم ہیں جو مختلف موضوعات پر مشتمل ہیں۔ میں نے اپنی تحقیق کے لیے پچاس کالم منتخب کیے ہیں اور اُن منتخب شدہ کالموں میں ادبی، سیاسی، تاریخی، مذہبی، سماجی، سیاحتی، ثقافتی اور معاشی جہات کے تناظر میں، ہر عنوان سے متعلقہ کالم کا الگ الگ تنقیدی مطالعہ کیا ہے اور کالم نگاری کے لحاظ سے محمد اظہار الحق کی فکر کے مختلف پہلوؤں کو سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ اس تحقیقی کام کے لیے میں نے اپنے مقالے کو چار ابواب میں منقسم کیا ہے۔ جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

پہلا باب "محمد اظہار الحق بحیثیتِ اردو کالم نگار" ہے۔ چونکہ یہ تحقیق بنیادی طور پر کالم نگاری کے حوالے سے ہے۔ لہٰذا سب سے پہلے میں نے اپنے تحقیقی موضوع کا تعارف کرایا ہے، پھر مسئلے کا بیان، مجوزہ موضوع پر ماقبل تحقیق، اِس تحقیق کی اہمیت، تحدید، تحقیقی مقاصد اوران مقاصد کی تکمیل کے لئے اختیار کردہ تحقیقی سوالات شامل کیے ہیں، پھر کالم کا لغوی معنی اور اصطلاحی مفہوم واضح کیا گیا ہے۔ پھر بتایا گیا ہے کہ کالم نگاری کیا ہے؟ کالم کا مفہوم واضح کرنے کے ساتھ ساتھ کالم نگاری کی مختصر تاریخ اور اس کی روایت بیان کی گئی ہے۔ اِس کے بعد کالم نگار محمد اظہار الحق کا مختصر تعارف پیش کیا گیا ہے اوران کی ادبی خدمات، مصروفیات اور اعزازات کے بارے میں بتایا گیا ہے اور تحقیقی کام کے دوران محمد اظہار الحق سے کی جانے والی ملاقات میں اُن کی طرف سے فراہم کردہ مختلف مستند معلومات بھی اِس باب میں شامل کی گئی ہیں اور پہلے باب کے آخر میں اِس باب سے متعلقہ حوالہ جات شامل کیے گئے ہیں۔

باب دوم "محمد اظہار الحق کی کالم نگاری کی ادبی، سیاسی، تاریخی اور مذہبی جہات کا تنقیدی مطالعہ" ہے۔ اِس باب میں محمد اظہار الحق کے کالموں سے زبان و ادب، سیاست و عدل، تاریخ و تمدن نیز دین و مذہب کے حوالے سے ہر موضوع کے تحت الگ الگ منتخب شدہ کالموں کا موضوعاتی اور فکری لحاظ سے تفصیل کے ساتھ تحقیقی اور تنقیدی مطالعہ کیا ہے۔

باب سوم "محمد اظہار الحق کی کالم نگاری کی سماجی، سیاحتی، ثقافتی اور معاشی جہات کا تنقیدی مطالعہ" ہے۔ اِس باب میں محمد اظہار الحق کے کالموں سے ایسے منتخب کالموں کا موضوعاتی اور فکری لحاظ سے تفصیل کے ساتھ تحقیقی اور تنقیدی مطالعہ کیا ہے جو تہذیبی، سماجی، معاشی اور ثقافتی رجحانات پر مبنی ہیں اور جن میں تعلیم و تفریح کا بیان ہے نیز جن میں مفاداتِ عامہ کی بات کی گئی ہے۔

باب چہارم: چوتھے اور آخری باب میں تحقیق کا مکمل نچوڑ پیش کیا گیا ہے۔ اس میں مجموعی جائزہ کے تحت گزشتہ تحقیق کا جائزہ پیش کیا گیا ہے اور اس تمام تر تحقیق سے جو نتائج سامنے آئے ہیں اُن کو "نتائج" کے تحت درج کر دیا گیا ہے۔ نیز محمد اظہار الحق کی کالم نگاری کے بارے میں چند ہم عصر کالم نگاروں اور ادیبوں کی آراء کو بھی اِس باب میں شامل کیا گیا ہے۔

جبکہ تمام تر تحقیق کو مد نظر رکھتے ہوئے سفارشات بھی پیش کی گئی ہیں اور اس کے بعد اختتامی صفحات میں کتابیات کی مختصر تفصیل پیش کی گئی ہے، جن سے اِس تحقیق کے دوران استفادہ کیا گیا ہے اور باب کے سب سے آخر میں اشاریہ شامل کیا گیا ہے، جس میں اُن تمام موضوعات اور اُن سے متعلقہ کالموں کی فہرست پیش کی گئی ہے جو اِس تحقیق میں شامل ہیں۔

Abstract

The title of my research, thesis for M. Phil Urdu is “A critical Study of ideological dimensions of Muhammad Izhar-Ul-Haq’s Column writing”. Only some selected Columns of “Talakh Nawai” have been taken in this research. This Book was published in 2016. The purpose of this research is to study of Muhammad Izhar-Ul-Haq’s Column writing and bring out thoughts and thinking of him about daily human and social life. The columns of Muhammad Izhar ul Haq have unique identity. The central theme of these columns helped us to understand the ideology of Columnist.

This research has been divided into four chapters. The first Chapter has the title of “Muhammad Izhar ul Haq as an Urdu Columnist”. In starting of this chapter a brief introduction of my research work is presented, after that a short discussion has been made about “what is a Column?”, and “A brief history of columns”. Third portion of this chapter has also been described the personality of Muhammad Izhar ul Haq, his contribution in Urdu literature and his achievements due to his untiring efforts.

The second chapter is “A Critical Study of literary, political, historical and religious dimensions of Muhammad Izhar ul Haq’s Column writing” .This chapter is divided into four sections. In first section literary, in second section political, in third section historical and in last section religious dimensions of Muhammad Izhar ul Haq’s Column writing are described separately.

The third chapter is “A Critical Study of social, cultural and economical dimensions of Muhammad Izhar ul Haq’s Column writing”. This chapter is also divided into four sections. In first section social and cultural trends, in second section educational, sports and welfare, in third section scientific and tourism aspects were discussed and in last section economical and social problems in Muhammad Izhar ul Haq’s Column writing are described separately in detail.

In the Fourth Chapter an overall analysis has been made. This chapter is based on a comprehensive study ,Conclusions and recommendations deduced as a result of the overview of the discussion in the first three chapters, reaching a summarize and compiling a few suggestions at the end.

مقالے کا مقصد

یہ تحقیقی مقالہ " محمد اظہار الحق کی کالم نگاری کی فکری جہات کا تنقیدی مطالعہ (تلخ نوائی کے منتخب کالموں کے حوالے سے)" کے عنوان سے ہے۔ محمد اظہار الحق کی کالم نگاری کے حوالے سے دیکھا جائے تو اُنھوں نے جو بے مثال اور شاہکار اردو کالم لکھے ہیں اُن میں ہمیں اُن کی فکر کی نئی جہات ملتی ہیں۔ محمد اظہار الحق نے کم و بیش ہر موضوع پہ لکھا ہے اور جس موضوع پر بھی قلم اٹھایا ہے تو پھر اپنے قلم کا حق نبھایا ہے۔ محمد اظہار الحق کے کالم اپنے منفرد انداز، سادہ زبان اور عام موضوعات کی وجہ سے شہرت رکھتے ہیں۔ زیرِ نظر تحقیقی مقالے کا مقصد محمد اظہار الحق کے منتخب کالموں کے تنقیدی مطالعے کے بعد اُن کے موضوعات اور اُن کی فکری جہات کو سامنے لانا ہے۔ اِس کے ساتھ ساتھ ہم عصر کالم نگاروں میں محمد اظہار الحق کی کالم نگاری کی انفرادیت کا جائزہ لینا بھی مقصود ہے۔ اِس تحقیقی مقالے ایک مقصد کا یہ بھی ہے کہ اس بات کا جائزہ لیا جائے کہ محمد اظہار الحق جو کہ معروف کالم نگار، شاعر اور محقق ہیں اور اُن کی شاعری کے حوالے سے اُن پہ کافی کام ہو چکا ہے اور کئی کتابیں بھی لکھی جا چکی ہیں۔ لیکن اُن کے کالموں کے حوالے سے اِس سے پہلے کوئی کام نہیں کیا جا سکا ہے۔ چونکہ اردو ادب کے فروغ میں اردو صحافت کا شروع سے اب تک اہم اور قابلِ قدر کردار رہا ہے اور آج کا دور ہی صحافت کا دور ہے اور موجودہ دور کی صحافت میں کالم نگاری کو خاص اور نمایاں اہمیت حاصل ہے۔ اکثر اخبارات کی کامیابی کا انحصار ہی اُس کے اداریوں اور کالموں پر ہوتا ہے۔

محمد اظہار الحق کا شمار عصرِ حاضر کے معروف کالم نگاروں میں ہوتا ہے جو پچھلی تین دہائیوں سے مسلسل لکھتے آ رہے ہیں۔ محمد اظہار الحق نے معاشرے کے تمام طبقات کے لیے لکھا ہے اور روزمرہ زندگی کے عام موضوعات پر قلم اٹھایا ہے۔ اُنھوں نے اپنے کالموں میں سادگی اور اختصار کے ساتھ حقیقی زندگی کے مسائل کی بڑی سچائی کے ساتھ عکاسی کی ہے۔ اِس لحاظ سے محمد اظہار الحق کے کالموں کا مطالعہ ضروری ہو جاتا ہے تاکہ ان کی تحریروں میں موجود فکر کو ادبی دنیا کے سامنے لایا جا سکے۔

اظہارِ تشکّر

میں مقالے کی تکمیل کے لیے اللہ تعالیٰ کا بے حد شکر گزار ہوں کہ اُس کے کرم کی بدولت میرا کام بروقت پایہ تکمیل تک پہنچا ہے۔ اس کے بعد میں شکر گزار ہوں نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز اسلام آباد کی صدرِ شعبہء اردو ڈاکٹر روبینہ شہناز، کوآرڈینٹر ڈاکٹر فوزیہ اسلم اور انتہائی واجب الاحترام اساتذہ کرام کا، جن کی شفقت ہر لمحہ مجھے میسر رہی۔ میں نگران مقالہ ڈاکٹر عنبرین تبسم شاکر جان کا انتہائی مشکور ہوں کہ اُنہوں نے ابتدا سے اب تک ہر مرحلے پر مجھ ناچیز کا ساتھ دیا اور تحقیق کے ہر موڑ پر ان کی شفقت اور رہنمائی میرے شاملِ حال رہی اور مجھے جس وقت بھی ان کی ضرورت محسوس ہوئی وہ میری مدد اور تحقیقی رہنمائی کے لیے موجود رہیں۔ اُن کی حوصلہ افزائی کی بدولت تحقیقی سفر کے کٹھن مراحل آسانی سے طے ہوتے چلے گئے۔ میں کالم نگار محمد اظہار الحق صاحب کا دلی ممنون ہوں، اوراُن کی شفقتوں اور عنایتوں پر تہہ دل سے اُن کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے میرے ہر رابطے کا بھرپور اور مثبت جواب دیا اور اپنے قیمتی لمحات میں سے ایک پورا دن مجھے عنایت کیا۔

اپنے والدین کا خاص طور پر مشکور ہوں کہ جن کی دعائیں تحقیق کے تمام مراحل میں میرے ساتھ رہیں۔ میں تمام دوستوں کا شکر گزار ہوں جن کی حوصلہ افزائی مجھے پل پل میسّر رہی ہے۔ خاص طور پہ اپنے شفیق دوست عرفان طارق کا شکریہ ادا کروں گا، جنھوں نے ایم اے اردو کے بعد ایم فل کے لیے نہ صرف تحریک دی بلکہ استفادہ کے لیے اپنی کتب اور مفید مشوروں سے نوازا اور جب بھی میں نے کام اور رہنمائی کے سلسلے میں اُن سے رابطہ کیا اُنہوں نے خلوص و مروت کا برتاؤ کیا۔ آخر میں اپنے بہن بھائیوں اور رفیقۂ حیات کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گا جنہوں نے یکسوئی سے کام کرنے کے لیے ماحول فراہم کیا اور دیگر مصروفیات سے بری الذمہ کیا نیز میرے کام کے حوالے سے مجھے تحریک دی تاکہ میں جلد سے جلد اپنا کام مکمل کر سکوں۔ اللہ تعالیٰ سب کو جزائے خیر دے۔ آمین

محمد حنیف

اسکالر ایم فل اُردو

باب اول

محمد اظہار الحق بحیثیت اردو کالم نگار

ا)۔ موضوع کا تعارف:

مجوزہ تحقیقی مقالہ "محمد اظہار الحق کی کالم نگاری" پاکستان کی معروف ادبی شخصیت کی کالم نگاری کی فکری جہات کا تجزیاتی اور تنقیدی مطالعہ ہے۔ آپ کا شمار عصرِ حاضر کے اہم کالم نگاروں میں ہوتا ہے۔ آپ صرف کالم نگار ہی نہیں ہیں بلکہ ملکِ پاکستان کے معروف شاعر اور محقق بھی ہیں۔ شاعری میں اعلیٰ مقام کے حامل محمد اظہار الحق کی چار کتابیں "دیوارِ آب "(۱۹۸۲ء آدم جی ایوارڈ یافتہ) ، "غدر" (۱۹۸۶ء)، پری زاد" (۱۹۹۵ء) اور "پانی پہ بچھا تخت" (۲۰۰۳ء علامہ اقبال ایوارڈ یافتہ) شائع ہو چکی ہیں۔ ان تمام چار کتب کا مجموعہ ۲۰۱۲ء میں "کئی موسم گذر گئے مجھ پر" کے نام سے منظر عام پر آیا۔ ان کی شاعری کو یاسمین حمید نے انگریزی میں ترجمہ کر کے "پاکستانی اردو شاعری" کے نام سے ۲۰۱۰ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی پریس سے کتابی شکل میں شائع کرایا۔

محمد اظہار الحق پاکستان کے چوٹی کے اخبارات مثلاً روزنامہ جنگ، نوائے وقت، جناح، دنیا اور موجودہ وقت میں روزنامہ ۹۲ نیوز میں باقاعدگی سے "تلخ نوائی" کے عنوان سے کالم لکھتے ہیں۔ ان کے کالم سیاست، معاشرت، ترقی پسندی، اخلاقیات اور مذہب کے گرد گھومتے ہیں۔ آپ کے کالموں میں جہاں دلکش انفرادیت ہے وہیں اردو اور فارسی میں مہارت کی وجہ سے آپ کے کالموں میں ان دونوں زبانوں کی ادبی چاشنی جھلکتی ہے۔ آپ کے کالم عام فہم ہونے کی بنا پر عوامی سطح پر پسندیدگی اور دلچسپی سے پڑھے جاتے ہیں۔ اگرچہ اردو میں محمد اظہار الحق کی کالم نویسی مستقل حیثیت کی حامل ہے مگر ساتھ ساتھ وہ انگریزی میں بھی کالم لکھتے رہتے ہیں جو ملکی سطح پر دی نیوز The News، اور بین الاقوامی سطح پر بنگلہ دیش میں دی بنگلہ دیش ٹوڈے The Bangladesh Today اور آسٹریلیا میں دی ایج The Age اخبار میں چھپتے رہتے ہیں۔

محمد اظہار الحق نے ادارہ قومی زبان کی معاونت کرتے ہوئے قومی اردو انگلش لغت کی تیاری میں بھی اپنا حصہ ڈالا۔ اردو ادب میں اعلیٰ اور معیاری خدمات کے اعتراف میں حکومتِ پاکستان نے محمد اظہار الحق کو ۲۰۰۸ء میں پرائیڈ آف پرفارمنس سے نوازا۔

بیانِ مسئلہ:

محمد اظہارالحق اہم ادبی شخصیت ہیں۔ انھوں نے اپنی کالم نگاری کے ذریعے اردو ادب میں خاطر خواہ اضافہ کیا ہے۔ سال ۲۰۱۶ء میں ان کے کالموں کا مجموعہ "تلخ نوائی" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ ان کے کالموں کے مجموعے پر تا حال کوئی کام نہیں ہوا ہے۔ میری اِس تحقیق کا مقصد بطورِ کالم نگار محمد اظہار الحق کی انفرادیت اور افادیت کا جائزہ لیتے ہوئے اُن کی کالم نگاری کی فکری جہات کا تنقیدی مطالعہ اور تجزیہ پیش کرنا ہے۔

مجوزہ موضوع پر ما قبل تحقیق:

محمد اظہار الحق کی کالم نگاری اپنی انفرادیت کے اعتبار سے ایسا موضوع ہے جس پر اس سے قبل کسی سکالر اور محقق نے کام نہیں کیا ہے۔ اُن کے فن، شخصیت اور اُن کی کالم نگاری کے کتابی مجموعے پر ابھی تک کسی بھی جامعہ میں کسی بھی سطح کا کوئی کام نہیں ہوا ہے۔ میری یہ تحقیق ان کی شخصیت اور فن پر اپنی نوعیت کا پہلا کام ہو گا۔

تحقیق کی اہمیت:

محمد اظہارالحق نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے کیا۔ بطورِ شاعر ان کے چار مجموعے شائع ہوئے۔ مگر وہ نوے کی دہائی سے شاعری کے ساتھ ساتھ اردو اور انگریزی زبان میں کالم بھی لکھتے رہے ہیں جو کہ صفِ اول کے قومی اور بین الاقوامی اخبارات میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ان کے کالم اپنے انوکھے موضوعات کی بنا پر پسند کیے جاتے ہیں۔ مجوزہ تحقیق اس لحاظ سے اہم ہو گی کہ اس میں ان کی کالم نگاری کا موضوعاتی تجزیہ کر کے ان کے کام کو سامنے لایا جائے گا۔ یہ تحقیق کالم نگاری میں محمد اظہارالحق کے ادبی مقام اور انفرادیت کو متعین کرنے میں معاون ثابت ہو گی علاوہ ازیں کالم چونکہ اخبارات میں باقاعدگی کے ساتھ شائع ہوتے ہیں اور کوئی

مضمون جب تک اخبار میں شائع نہ ہو کالم نہیں کہلا سکتا ہے، اسی لیے کالم کو صنفِ ادب نہیں بلکہ صرف صنفِ صحافت سمجھا جاتا ہے، اس لیے میں نے ضروری سمجھا کہ اپنی اِس تحقیق میں اِس غلط فہمی کو بھی دور کرنے کی کوشش کروں۔

تحدید:

اس تحقیقی مقالے میں محمد اظہار الحق کی صرف "اردو کالم نگاری" کا جائزہ لیا جائے گا۔ یہ مقالہ بس ان کی کالم نگاری کے فکری جہات کے مطالعے تک محدود رہے گا اور اِس تحقیق میں اُن کی کالم نگاری کے صرف وُہ منتخب کالم ہی شامل کئے جائیں گے جن کی مختصر تفصیل آخر میں دیے گئے اشاریہ میں موجود ہے۔

تحقیقی مقاصد:

مجوزہ تحقیقی مقالے کے مقاصد درج ذیل ہیں۔

۱۔ اردو کالم نگاری کا تعارف اور ارتقاء ایک جائزہ

۲۔ محمد اظہار الحق کی اردو کالم نگاری کی فکری جہات کا تجزیہ

۳۔ ادبی منظر نامے /کالم نگاری میں محمد اظہار الحق کی انفرادیت اور ادبی افادیت کا تعین

تحقیقی سوالات:

مجوزہ تحقیق کے دوران مندرجہ ذیل سوالات سامنے رکھے جائیں گے۔

۱۔ محمد اظہار الحق کی کالم نگاری کے موضوعات کیا ہیں؟

۲۔ محمد اظہار الحق کے کالموں کا پسِ منظر کیا ہے؟

۲۔ محمد اظہار الحق کی کالم نگاری کی اہم خصوصیات کون کون سی ہیں؟

نظری دائرہ کار:

محمد اظہار الحق عصرِ حاضر کی اہم ادبی شخصیت ہیں۔ ان کی مختلف ادبی جہات ہیں مثلاً غزل گوئی ، نظم نگاری، کالم نگاری اور تحقیق وغیرہ۔ موضوع کے اعتبار سے ان کی کالم نگاری سیاست ،معاشرت ،معیشت ، ترقی

پسندی، اخلاقیات اور مذہب کے گرد گھومتی ہے۔ اس وجہ سے یہ تحقیقی کاوش ان کے کالموں کی فکری جہات کو سمجھنے میں معاون اور مددگار ثابت ہو گی۔

پس منظری مطالعہ:

پس منظری مطالعے کے طور پر معاصر نثری ادب اور اس حوالے سے لکھے گئے تنقیدی مضامین، تبصروں، تجزیوں اور آراء کو پیش نظر رکھا جاے گا۔ جو مختلف اخبارات اور رسائل و جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔

تحقیقی طریقہ کار:

مجوزہ موضوع پر تحقیق کے لیے دستاویزی طریقہ کار اختیار کیا جائے گا۔ جس کے مطابق درج ذیل امور پیشِ نظر رہیں گے۔

الف۔ محمد اظہار الحق اور ان کے اہلِ خانہ سے ملاقات اور انٹرویوز۔

ب۔ معاصر کالم نگاروں کی رائے بذریعہ سوالنامہ۔

ج۔ معاصر ادبی جرائد میں شائع ہونے والے تبصرے اور تجزیے۔

د۔ سرکاری و نجی کتب خانوں میں متعلقہ کتب سے استفادہ۔

ب)۔ کالم نگاری کیا ہے؟

اگرچہ موجودہ دور میں الیکٹرانک میڈیا اور سوشل میڈیا کا استعمال سب سے زیادہ ہے مگر پھر بھی پرنٹ میڈیا نے اپنی قدر اور افادیت کبھی بھی کم نہیں ہونے دی ہے۔ آج بھی خصوصاً کالم نگاری ایک بہت ہی معروف اور ہر دل عزیز صنفِ نثر ہے اور اِسے ایک اہم اور موثر ادبی صنف بھی سمجھا جاتا ہے۔ اخبارات و رسائل سے اٹوٹ بندھن کی وجہ سے کالم نگاری کو علمِ صحافت سے کسی طور بھی الگ کرنا ممکن نہیں ہے۔ صحافت میں کالم نگاری کی اہمیت و افادیت اِس قدر زیادہ ہے کہ اِس کے بغیر کوئی اخبار بھی مکمل نہیں ہو سکتا ہے۔ خصوصاً ایسے حالات میں کہ جب خبروں پر سنسر شپ ہو تو کالم نویس ہی اپنے مخصوص اسلوب اور علامتی طرزِ تحریر کے

ذریعے حالات و واقعات کی صحیح، سچی اور کھری تصویر قارئین تک پہنچا سکتا ہے۔ کالم نگاری میں ایک کالم نگار روز مرہ زندگی اور معاشرے کے ہر پہلو کو اپنے کالموں کا موضوع بنا سکتا ہے۔ سیاست، معیشت، معاشرت، تعلیم، نفسیات، اقتصادیات، طبیعات، سائنس اور تاریخ غرض یہ کہ ہر اُس موضوع پر کالم لکھا جا سکتا ہے جو وقت اور حالات کا متقاضی ہو۔ انھی ہمہ گیر خصوصیات کی وجہ سے کالم نگاری کو دنیائے ادب اور دنیائے صحافت اپنی اپنی میراث سمجھتی ہیں بہر حال کسی طور بھی اِس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ کالم نگاری نے اردو زبان و ادب کی بہت ہی گراں قدر خدمت کی ہے، ابتدا سے لے کر اب تک اردو کی جتنی نثر کالم نگاری کی صورت میں تخلیق ہوئی ہے شاید ہی کسی دوسری صنفِ نثر میں تخلیق ہوئی ہو۔

دنیا کی دیگر معروف زبانوں کی طرح اردو کے بھی روزانہ درجنوں اخبارات نیز ہفت روزہ، پندرہ روزہ اور ماہانہ رسائل و جرائد شائع ہوتے ہیں اور ہر اخبار اور ہر رسالے میں کئی کالم چھپتے ہیں۔ یوں ایک دِن میں سینکڑوں کالم لکھے جاتے ہیں اور سال ہا سال سے کالموں کی تخلیق کا یہ سلسلہ جاری ہے۔ کالم نگاری کا یہ سفر اتنا کامیاب ہے اور اپنے دامن میں اتنی وُسعت رکھتا ہے کہ اکثر کامیاب کالم نگاروں کے تو کئی کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں اور بہت سارے کالم نویس تو اپنا تخلیقی سفر درجہءِ کمال تک پہنچانے کے بعد اپنا وقت پورا کر کے اِس جہانِ فانی سے رخصت بھی ہو چکے ہیں مگر اُن کا فن، اُن کے بے مثل کالموں اور اُن کی لازوال تحریروں کی صورت میں آج بھی زندہ و جاوید ہے۔

ج)۔ کالم کا لفظی و لغوی معنی

کالم قدیم لاطینی زبان کے لفظ Columna، یونانی زبان کے لفظ Columne اور جدید فرانسیسی زبان کے لفظ Colonne سے انگریزی میں آیا ہے اور اِس کے لغوی معنی کھمبا، ستون، عمودی تقسیم یا لاٹھ کے ہیں۔ یہ لفظ کئی دوسرے معنوں میں بھی استعمال ہوا ہے مثلاً جب مختلف رقمیں جمع کے لیے اوپر نیچے رکھی جاتی ہیں تو انھیں Column of Figure کہتے ہیں۔ اِسی طرح فوج کا دستہ Column of Soldiers کہلاتا ہے اور وطن دشمن عناصر کے لیے Fifth Column کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں ۱۷۸۵ء سے لفظ کالم اخبارات کی زینت بننے والے تحریری مواد اور آرٹیکلز کے لیے استعمال ہوتا آیا ہے۔

آکسفورڈ ایڈوانسڈ لرنرڈ کشنری میں لفظ کالم کے درج ذیل معانی ملتے ہیں:

1. "A tall, solid, vertical post, usually round and made of stone, which supports or decorate a building or stands alone as a MONUMENT.
2. A thing shaped like a column: a column of smoke (= smoke rising straight up).
3. (abbr.col) one of the vertical sections into which the printed page of a book, newspaper, etc. is divided.
4. A part of a newspaper or magazine which appears regularly and deals with a particular subject or is written by a particular writer.
5. A series of numbers or words arranged one under the other down a page: to add up a column of figures.
6.A long moving line of people or vehicles."[1]

یعنی کالم سے مراد ایک لمبا، ٹھوس، عمودی کھمبا، عموماً پتھروں سے بنا گول ستون جو کسی عمارت کو ٹیک دینے یا محض سجاوٹی طور پر بنایا جاتا ہے یا پھر ایک یادگار کے طور پر تنہا اٹھایا گیا ہوتا ہے۔ یا پھر ستونی شکل کی کوئی بھی چیز جیسے دھوئیں کا ستون، مراد یہ کہ ستون کی شکل بناتا، سیدھا اٹھتا ہوا دھواں۔ یا پھر وہ عمودی خانے جن میں کسی کتاب یا اخبار کا چھپا ہوا صفحہ منقسم ہوتا ہے۔ یا پھر اخبار یا رسالے میں کسی مخصوص مصنف کی مسلسل چھپنے والی تحریریں۔ یا پھر اوپر نیچے لکھے الفاظ و اعداد کا سلسلہ۔ یا پھر لوگوں یا گاڑیوں کی حرکت کرتی لمبی قطار۔

د)۔ صحافتی و اصطلاحی معنی

اخباری صنعت میں کالم کا لفظ دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اولاً اخبار کے صفحات کی عمودی تقسیم کو کالم کہتے ہیں۔ پاکستان میں معیاری اخبارات کا صفحہ عموماً آٹھ کالموں میں تقسیم ہوتا ہے۔ کسی خبر کی سرخی جتنے زیادہ کالموں پر محیط ہوتی ہے اُس کی اہمیت بھی اُتنی ہی زیادہ ہوتی ہے۔ ایسی خبر کو شہ سرخی یا بینر ہیڈ لائن بھی کہتے

ہیں۔ ثانیاً اخبار نویسی میں کالم سے مراد ایک خاص صنفِ تحریر بھی ہے جو کوئی لکھاری اپنے اصلی یا قلمی نام سے، ایک مستقل عنوان کے تحت باقاعدگی سے اخبار میں لکھتا ہے اور یہ تحریر لکھنے والے کو کالم نویس کہتے ہیں۔

کالم نویسی کے ضمن میں مخصوص تحریر کا جو تصور ہمارے ذہن میں ابھرتا ہے اُسے چند لفظوں میں بیان کرنا اور کسی ایک متفقہ تعریف میں سمونا بہت ہی مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ دنیا کے بڑے بڑے کالم نویسوں نے اِس طرزِ تحریر کے بارے میں جو جو آراء پیش کی ہیں وُہ کئی لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور اُن میں سے کسی ایک رائے کو کالم کی قطعی، مستند اور مسلمہ تعریف قرار نہیں دیا جا سکتا ہے۔ فرہنگ اصطلاحات جامعہ عثمانیہ میں column (کالم) کے بارے میں کچھ یوں لکھا ہوا ہے:

": قطار، عمود، خانہ، کالم، ستون" [۲]

قومی انگریزی اردو لغت میں لفظ (کالم) column کے تحت لکھا ہوا ہے:

"۱۔ ایک پر دوسرا تحریری مواد جو عمودی طور پر لکھا گیا ہو۔ ۲۔ عمودی لائن۔ ۳۔ فوجی دستے کی ترتیب جس میں ایک کے پیچھے دوسرا سپاہی ایک سے زیادہ لائنوں میں کھڑا ہوتا ہے۔ ۴۔ دھوئیں کا عمودی طور پر اٹھنا۔ ۵۔ حساب کتاب کے لیے عمودی طور پر ایک کے اوپر دوسری رقومات کا لکھنا اور حساب جوڑنا۔ ۶۔ اخبارات میں لکھی گئی تحریریں۔" [۳]

اِسی طرح نور اللغات میں لفظ کالم کا معنی کچھ یوں بیان ہوا ہے:

"کالم (انگ، مذکر)۔ ۱۔ صفحے کا حصہ جیسے نور اللغات کے ہر صفحے میں دو کالم ہیں۔ ۲۔ فوج کا دستہ۔" [۴]

انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا میں کالم اور کالمسٹ یعنی کالم نگار کے متعلق یوں لکھا ہوا ہے:

"Columnist, the author or editor of a regular, signed contribution to a newspaper, usually under a permanent title and devoted to comment on some aspect of the contemporary science. The column may be humorous or

serious, on one subject or on life in general, frivolous in tone or heavily freighted with good advice on manners, moral or other subjects of interest. Essentially a column is a reflection of the writer`s individual tastes and point of view, whether it concerned with women hats, foreign policy or the stock market."[۵]

درج بالا تعریف کے مطابق کالم نویس سے مراد وہ مصنف یا ایڈیٹر ہے جو کسی اخبار میں اپنے نام و دستخط کے ساتھ ایک مستقل عنوان کے تحت مسلسل ایسی تحریریں لکھتا ہو جن کا مقصد عصری علوم یا حالاتِ حاضرہ کے مسائل پر تبصرہ کرنا ہو۔ ایک کالم مزاحیہ یا سنجیدہ ہو سکتا ہے اور اس کا لب و لہجہ شگفتہ، سخت یا ناصحانہ ہونے کے ساتھ ساتھ وہ اخلاقی بھی ہو سکتا ہے یا قارئین کی دلچسپی کے کسی بھی دوسرے موضوع پر لکھا ہوا ہو سکتا ہے۔ لازمی بات یہ ہے کہ ایک کالم کسی مصنف کے انفرادی ذوق یا نقطۂ نظر کا عکس ہوتا ہے، خواہ اس کے موضوع کا تعلق خواتین کے لباس سے ہو یا خارجہ پالیسی سے یا منڈی کے رجحانات سے ہو۔

ایک اور معروف ویب سائٹ دی فری ڈکشنری ڈاٹ کام کے مطابق:

Newspaper column: "An article giving opinions or perspectives".[۶]

اِس سے مراد یہ ہے کہ اخباری کالم ایسا مضمون ہوتا ہے جو کسی کی مخصوص رائے اور نقطہ ء نظر کا اظہار کرے۔

ایک اور مشہور ویب سائٹ ایٹی مانو لائن ڈاٹ کام پر لفظ کالم کے بارے میں یوں لکھا ہوا ہے:

Column (n) mid-15c "Vertical division of a page, "also" a pillar, post, "from O,Fr, colombe (12c,. Mod, Fr.Colonne "column, pillar"), from L.columna "pillar". Collacteral form of column "top, summit". From PIE root * kel-"to project". (See hill).

Sense of "matter written for a newspaper dates from 1775," [۷]

اسی طرح ایک اور جگہ ویب سائٹ ایٹی مانولائن ڈاٹ کام پر لفظ کالم کے بارے میں یوں لکھا ہوا ہے:

"Column [kol-uhm] show IPA noun

1. Architecture
2. A Rigid, relatively slender, upright support, composed of relatively few pieces.
3. A decorative pillar, most often composed of stone and typically having a cylindrical or polygonal shaft with a capital and usually a base.
4. Any column like object mass or formation, or a column of smoke.
5. A vertical row or list: Add this column of figures.
6. A vertical arrangement on a page of horizontal lines of type, usually typographically justified: There are three or four etc. columns on this page.
7. A regular feature of series of articles in a newspaper, magazine, or the like, usually having a readily identifiable heading and by line of the writer or editor, that reports or comments upon a particular field of interest , as politics, theater, or etiquette, or which may contain letters from traders, answers to readers, queries etc." [۸]

یعنی کالم سے مراد کھمبا یا ستون جو کسی عمارت میں ٹیک (سہارے) یا خوبصورتی کے لیے کھڑا کیا گیا ہو۔ اِسی طرح والٹر لیپ مین امریکہ کا بہت مشہور و معروف کالم نویس ہے۔ اُس نے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز اداریہ نویس کی حیثیت سے کیا بعد میں اُس نے ایسے فقید المثال اور معرکتہ الآراء کالم لکھے کہ امریکہ کی صحافتی تاریخ

میں اُس کا نام زندہ جاوید ہو گیا۔ اُس کا کہنا ہے کہ میں ایک کالم نویس کو بنیادی طور پر نام کے ساتھ اداریہ لکھنے والا شخص سمجھتا ہوں۔ اخبار یا رسالے میں کسی مستقل عنوان کے تحت، لکھنے والے کے نام کے ساتھ، باقاعدگی سے شائع ہونے والی، ایسی منفرد تحریر کالم کہلاتی ہے، جس میں تازہ حالات اور واقعات کے پس منظر زندگی یا معاشرے کے کسی ایک یا ایک سے زیادہ پہلوؤں کو موضوع بنایا گیا ہو۔ پاکستان کے ممتاز کالم نویسوں نے بھی کالم کے بارے میں اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ معروف کالم نگار احمد ندیم قاسمی کا خیال ہے کہ کالم کی کوئی متعین صورت نہیں ہے۔ جیسے میجر سعید ٹوانہ اور منو بھائی جو تحریر لکھتے ہیں، دونوں کالم کہلاتی ہیں لیکن دونوں کے مزاج میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اِسی طرح م۔ ش کی تحریروں اور میری تحریروں میں بہت نمایاں فرق ہے لیکن دونوں کو اخباری اصطلاح میں کالم کہا جاتا ہے۔ معروف ادیب، شاعر اور کالم نگار سید ضمیر جعفری نے اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا کہ بھئی ہم تو فوجی آدمی ہیں اور فوج کی اصطلاح میں کالم فوجی پلٹن کو کہتے ہیں لیکن صحافتی زبان میں کالم سے مراد مخصوص مقاصد رکھنے والی تحریریں ہیں جو مستقل عنوانات کے تحت چھپتی ہیں۔

معروف اردو کالم نگار اسد اللہ غالب کا خیال ہے کہ میں کالم نگاری کی اصل تعریف سے نابلد ہوں اگر اس کی کوئی تعریف ہے تو میرے خیال میں قاری اس سے بخوبی آگاہ ہے۔ جو کالم پڑھنے کے لائق ہو، اُس کے بارے میں کسی سے بھی پوچھا جا سکتا ہے۔ کالم چھپ جانے سے کالم نگار نہیں کہلایا جا سکتا، تحریر کی پذیرائی ہی اصل معیار ہے۔ معروف کالم نگار اور مزاح نویس ڈاکٹر محمد یونس بٹ نے ایک ملاقات میں بتایا کہ جو کچھ کالم نویس لکھتے ہیں وہی کالم ہے۔ ہر کالم نویس اپنا مخصوص مزاج اور انداز رکھتا ہے اِس لئے کالم کے لئے کسی خاص قسم کی پابندی لگانا مشکل ہے۔ اِسی طرح عابد مسعود تہامی کے خیال میں:

> "اخبار یا رسالے میں کسی مستقل عنوان کے تحت باقاعدہ وقفوں کے ساتھ، کسی مخصوص جگہ پر، خاص اسلوب میں، نام کے ساتھ لکھی گئی تحریر کو کالم کہیں گے۔ یہ تحریر عام اور خاص کسی بھی موضوع پر لکھی جا سکتی ہے"۔ [۹]

مجیب الرحمٰن شامی کا کہنا ہے کہ کالم کسی خاص اسلوب میں لکھی ہوئی، کسی خاص شخصیت کی ایسی تحریر کو کہتے ہیں جو کسی مستقل عنوان کے تحت کسی روزنامے یا ہفت روزہ میں باقاعدگی سے شائع ہوتی ہو، خواہ یہ مزاحیہ ہو یا طنزیہ، تاریخی ہو یا ثقافتی، طبی ہو یا سائنسی، سیاسی ہو یا غیر سیاسی، اِس میں اُس شخصیت کے ذاتی خیالات اور نُقطہءِ نظر کا اظہار ہوتا ہے۔ مشہور شاعر اور کالم نویس ظہیر کاشمیری کہتے ہیں کہ سیاسی، ثقافتی یا زندگی کے کسی بھی شعبے سے تعلق رکھنے والے وقتی اہمیت کے کسی بھی موضوع پر لکھی گئی مختصر تحریر کو کالم کا نام دیا جاتا ہے۔ اِس کی نوعیت کسی طرح کی بھی ہو سکتی ہے اور اِس کے اساس اور مزاج پر کوئی قید نہیں۔ اِسی طرح ابنِ انشاء کا کہنا ہے کہ میں کالم کو Essay سمجھتا ہوں اور جس طرح Essay ایک بے کراں چیز ہے، کالم بھی ایسا ہی ہے۔ "روزنِ دیوار سے" لکھنے والے مشہور و معروف کالم نگار عطاء الحق قاسمی کا کہنا ہے کہ کالم ایک تحریری کارٹون ہے۔ جِس میں کالم نویس الفاظ سے خاکہ تیار کرتا ہے۔ "غیر سیاسی باتیں" لکھنے والے عبد القادر حسن کہتے ہیں کہ جِس موضوع پر خبروں یا اداریے میں اظہارِ خیال نہ کیا جائے، اُس کے متعلق مستقل عنوان کے تحت کسی اخبار میں شائع ہونے والی تحریروں کو کالم کہا جائے گا اور اُس عنوان کے تحت یہ تحریر اخبار میں باقاعدگی سے شائع ہوتی ہے۔ م۔ ش (محمد شفیع) کا کہنا ہے کہ کالم کئی اقسام کے ہوتے ہیں اور مختلف کالم نویس مختلف شعبوں میں تخصیص حاصل کرتے ہیں اور اپنے تجربے اور علم کی بِنا پر اپنے کالم لکھتے ہیں۔ اِسی طرح علمِ صحافت کے معروف استاد ڈاکٹر مسکین علی حجازی کہتے ہیں کہ کسی مستقل عنوان کے تحت اخبار میں شائع ہونے والی تحریر کو کالم کہتے ہیں۔ ڈاکٹر شفیق جالندھری نے کالم کی تعریف یوں کی ہے کہ کسی مستقل عنوان کے تحت اخبار یا رسالے میں شائع ہونے والی تحریر کو کالم کہتے ہیں جو عموماً لکھنے والے کے نام کے ساتھ شائع ہوتی ہے جب کہ زیڈ اے سلہری کے نزدیک کالم ایک ایسی تحریر ہے جسے ہر سوچنے، سمجھنے والا شخص جِس کے ذہن میں کہنے کو کچھ ہے، لکھ سکتا ہے۔ ڈاکٹر عبد السلام خورشید لکھتے ہیں کہ ہر اخبار میں کچھ مستقل عنوان ہوتے ہیں۔ بعض کے تحت خبریں، اعلانات یا معلومات پیش کی جاتی ہیں اور بعض کے تحت مزاحیہ، نیم مزاحیہ، طبی، سائنسی اور پس منظری مواد دیا جاتا ہے اور اِسی پس منظری عنوانات کو صحافتی اصطلاح میں کالم یا خصوصی کالم

کہتے ہیں اور لکھنے والے کے لئے کالم نویس یا کالم نگار کی اصطلاح رائج ہے، کالم نویس چاہے تو اپنا اصل نام دے دے یا چاہے تو قلمی نام اختیار کر لے۔

کالم کے بارے میں درج بالا جتنی بھی تعریفیں اور آراء پیش کی گئی ہیں، وُہ اپنی ذات میں مکمل نہیں ہیں۔ اِن میں سے کسی بھی تعریف کو قطعی قرار نہیں دیا جا سکتا ہے کیونکہ ہر تعریف میں کوئی نہ کوئی پہلو نظر انداز کیا گیا ہے۔ تاہم اِن تمام آراء کی روشنی میں جو نکات اخذ کیے جا سکتے ہیں، اُن میں سے کچھ درج ذیل ہیں۔

۱۔ کالم کسی ایک، مستقل عنوان کے تحت لکھی جانے والی تحریر ہے۔

۲۔ کالم کے لیے زندگی اور معاشرے کے ہر پہلو کو موضوعِ بحث بنایا جا سکتا ہے۔

۳۔ کالم اپنے لکھنے والے کی شخصیت کے رنگ کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔

۴۔ کالم کا اسلوبِ بیان شگفتہ، مزاحیہ یا سنجیدہ ہوتا ہے۔

۵۔ کالم نویس اپنے اصلی یا قلمی نام سے لکھتا ہے۔

۶۔ کالم نویسی میں حالاتِ حاضرہ اور تازہ واقعات کے پس منظر کو خاص اہمیت حاصل ہوتی ہے۔

۷۔ کالم نویس کا اہلِ فکر، اہلِ نظر اور کہنہ مشق ہونا ضروری ہے۔

۸۔ کالم میں تجزیے، تنقید، فکاہت اور مطالبات کے عناصر نمایاں ہوتے ہیں۔

۹۔ روزمرہ اخبار اور ہفت روزہ دونوں میں کالم کو ایک اہم تحریر کی حیثیت حاصل ہے۔

۱۰۔ کالم کا موضوع اور اُس پر بحث، کالم نویس کے علاوہ دیگر قارئین کے خیالات، جذبات اور احساسات کی عکاسی بھی کرتی ہے۔

نامور صحافیوں، کالم نویسوں اور صحافت کے اساتذہِ کرام نے کالم کے بارے میں جِن جِن خیالات کا اظہار کیا ہے، اُن میں اُن تمام خصوصیات پر روشنی ڈالی گئی ہے جو ایک معیاری کالم میں پائی جانی چاہئیں۔

کالم نویسی کی مختصر تاریخ میں اِس صنفِ تحریر کے بنیادی اصول متعین ہوئے ہیں اور کالم نویس کے اوصاف بھی طے کئے گئے ہیں۔ ابتدا میں کالم کی کوئی واضح ہئیت اور شکل و صورت نہیں تھی لیکن اِس نے بتدریج اور

تیز رفتاری سے ترقی کی منازل طے کرتے ہوئے موجودہ حیثیت حاصل کر لی جو جدید صحافت کے میدان میں اساسی پہلو کا درجہ رکھتی ہے لہذا اِن نکات و آراء کے پیشِ نظر کالم کی جامع تعریف یوں کر سکتے ہیں۔

اخبار یا رسالے میں کسی مستقل عنوان کے تحت لکھنے والے کے نام کے ساتھ باقاعدگی سے شائع ہونے والی، ایسی منفرد تحریر کالم کہلاتی ہے، جِس میں تازہ حالات اور واقعات کے پس منظر میں زندگی یا معاشرے کے کسی ایک پہلو یا زیادہ پہلوؤں کو موضوع بنایا گیا ہو۔

درج بالا تعریف کو کالم کی جامع تعریف قرار دیا جا سکتا ہے کیونکہ ایک معیاری کالم کی اہم خصوصیات اِس تعریف میں سمو دی گئی ہیں اور یہ تعریف کالم کی جن خوبیوں کو اجاگر کرتی ہے، وہ یہ ہیں۔

کالم کسی اخبار یا رسالے میں شائع ہونے والی تحریر کا نام ہے۔

کالم مستقل عنوان کے تحت لکھا جاتا ہے۔

کالم باقاعدگی سے شائع ہوتا ہے۔

کالم کی تحریر کے ساتھ اُس کے لکھنے والے کا نام درج ہوتا ہے۔

کالم کی تحریر کا اسلوب منفرد ہوتا ہے، چاہے وہ سنجیدہ ہو یا فکاہیہ، تجزیاتی ہو یا وضاحتی۔

تازہ حالات اور واقعات کالم نویسی کے لیے اساسی درجہ رکھتے ہیں۔

انسانی روزمرہ زندگی اور معاشرتی مسائل سے موضوع تلاش کیے جاتے ہیں چاہے اِن موضوعات میں زندگی اور معاشرے کے کسی ایک پہلو پر بحث کی گئی ہو یا زیادہ پہلوؤں پر۔ کالم نویس کے بارے میں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ کالم کسی صورت میں اول سے آخر تک بیانیہ نہیں ہو سکتا ہے۔ کالم کا آغاز کسی بیان سے ضرور کیا جا سکتا ہے اور اِس کا اختتام بھی بیان پر ہو سکتا ہے لیکن جب تک کالم نگار اپنے مخصوص انداز میں تبصرہ نہ کرے اور تجریدی، علامتی یا براہِ راست طریقے سے اپنے خیالات کا رنگ نہ بھر دے اور اپنی نگارشات کو مقصدیت کے تحت قارئین کو کسی نتیجے یا منزل پر پہنچانے میں مدد نہ دے، اُس وقت تک تحریر اعلیٰ معیار کا کالم کہلانے کے قابل نہیں ہو سکتی ہے۔

ر)۔ اردو کالم نگاری کی مختصر روایت:

کالم نگاری کی تاریخ کا کوئی باقاعدہ اور باضابطہ آغاز نہیں ملتا ہے۔ اٹھارہویں صدی کے آخر میں امریکہ میں وال پول کے جریدہ "ویکلی میوزیم" میں ایک مزاحیہ کالم شائع ہوتا تھا جو نظم اور نثر دونوں اصناف میں چھپتا تھا۔ اگرچہ اُس زمانے میں کالم کا وہ تصور موجود نہیں تھا جو آج ہے تاہم اُس عہد کی تحریروں کے ساتھ بھی لکھنے والے کا نام شائع ہوتا تھا اور اخبار میں انھیں مخصوص جگہ دی جاتی تھی۔ "ویکلی میوزیم" میں چھپنے والا کالم جوزف ڈینسی کے نام سے شائع ہوتا تھا۔ انگریزی کے برعکس اردو میں کالم نگاری کی روایت اتنی ہی قدیم ہے جتنا کہ خود اردو اخبار نویسی ہے۔ یہ درست ہے کہ اردو کے ابتدائی اخباروں میں کالم اپنی موجودہ شکل وصورت میں شائع نہیں ہوتا تھا۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ اردو اخبار نویسی کے ابتدائی دور میں جو خبریں بھی اخبار کی زینت بنتی تھیں اُن میں خبر کم اور تبصرہ زیادہ ہوا کرتا تھا۔ خبر کچھ اِس طرح سے دی جاتی تھی کہ اُس کا پڑھنے والا نہ صرف واقعے سے آگاہ ہو سکے بلکہ اُس خبر کے سیاق وسباق سے بھی بخوبی واقف ہو سکے اور پوری خبر سے دلچسپی کے ساتھ کما حقہٗ مستفید بھی ہو سکے۔ چونکہ یہ خبر صرف خبر نہیں ہوتی تھی، اِس میں خبر نگار کی ذاتی رائے اور تبصرہ بھی شامل ہوتا تھا، اِس لیے اِس خبر کا پس منظر اور پیش منظر قارئین کے لیے بھرپور دلچسپی کا سبب بنتا تھا۔

مولانا امداد صابری کے بقول:

> "برصغیر پاک وہند میں اردو صحافت کا آغاز انیسویں صدی میں "جامِ جہاں نما" سے ہوا۔ اردو کا یہ پہلا اخبار ۱۶ مئی ۱۸۲۲ء کو کلکتہ سے جاری ہوا۔ اس اخبار کا کچھ عرصے تک دو تہائی حصہ فارسی میں اور ایک تہائی اردو میں نکلا"۔ [۱۰]

اُس دور میں تعلیم یافتہ لوگوں کی زبان فارسی تھی، اور اخبار بینی کا شوق بھی کم تھا، اِس لیے کچھ عرصے کے بعد یہ اخبار فارسی زبان میں شائع ہونے لگا مگر بعد میں پھر اردو میں اِس کا اجراء کیا گیا۔

ڈاکٹر مسکین علی حجازی اِس اخبار کے بارے میں کہتے ہیں:

"اکثر محققین اِس بات پر متفق ہیں کہ اردو کا پہلا اخبار "جامِ جہاں نما" تھا جو ۱۸۲۲ء کو کلکتہ سے جاری ہوا تھا"۔"

یہ اخبار ابتدا میں فارسی میں نکلتا تھا مگر ۱۸۲۲ء میں اِس کی زبان اردو کر دی گئی لیکن کچھ عرصے بعد ہی اردو زبان کے قدر شناس نہ ملنے کی وجہ سے اِس کو بند کر دیا گیا مگر بعد میں یہ پھر جاری ہوا جو ۱۸۲۸ء تک شائع ہوتا رہا۔ اگر اس اخبار میں شائع ہونے والی خبروں کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ آج کے دور کی طرح خبر رپورٹ نہیں ہوتی تھی بلکہ باقاعدہ خبر نگاری کی جاتی تھی اور خبر کی زبان اور اسلوب کو بڑی اہمیت دی جاتی تھی اور خبر کچھ اس طرح لکھی جاتی تھی کہ جیسے آج کل کالم لکھا جاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائی دور کی اخبار نویسی کی خبروں کے مروج طریقہ ءِ کار ہی سے موجودہ دور کے کالم نے جنم لیا ہے۔ اِس ضمن میں عبد السلام خورشید نے یکم اکتوبر ۱۸۲۵ء کے "جامِ جہاں نما" کی مندرجہ ذیل خبروں کا حوالہ دیا ہے:

"ستی کی خبر: نیپال کے کاغذ سے سمجھا گیا کہ بھیم سین، جو اس راج کا مختار تھا۔ اس کا بھتیجا وزیر سینی، پالیا کی طرف گیا تھا، وہ مر گیا۔ دونوں جوروا اُس کی لاش کے ساتھ جل گئیں اور جلا دیا۔ ایک انوکھی خبر یہ بھی لکھی ہے کہ نیپال میں ایک شخص کی جورو نے اپنے کل کی لاج چھوڑ کر کسی غیر کے ساتھ ہیل میل کیا تھا۔ جب اُس کے شوہر نے جانا کہ عورت بد چلن ہو گئی ہے تو اُس کے یار کو مار ڈالا۔ وُہ عورت کہ برسوں سے اپنے یار کی محبت کی آگ سے جل بھن رہی تھی، اُس کی لاش سے لپٹ کر ایسے بے دھڑک آگ میں گھسی کہ راکھ کے سوا اُس کے بدن سے کچھ نشان نہ رہا۔۔۔ اخبار کے کاغذ میں دیکھا گیا کہ برہان پور کے ملک میں دکن کے علاقے میں ایک برہمن رہتا تھا۔ اتفاقات سے وُہ ایک دن کسی کام کے واسطے ایک جنگل میں جا نکلا۔ اُس کو اکیلا دیکھ کر ایک باگھ، کئی دن کا بھوکا، جو اپنی تھل میں پڑا ہوا تھا، یک بارگی بجلی کی طرح تڑپ کر اُس دکھیا برہمن پر گرا۔ حقیقت میں چنڈال غریب برہمن کے خون کا پیاسا تھا۔ اپنا کام کر گیا۔ یہ خبر برہمن کے گھر پہنچی۔ لوگ لاش کو جنگل میں اٹھا لائے۔ اُس کی بڈھی جورو نے بہتر برس کی عمر میں، کہ ہاتھ پاؤں ہلانے کی طاقت

نہیں، کیا ہی مردانہ کام کیا کہ اپنے شوہر کی لاش کے ساتھ جل کر راکھ ہو گئی۔ جس وقت وہ ستی ہونے چلی، خلق اللہ کا ہجوم تھا۔ اُس نے پکار کر یہ کہا، کہ اس برس مہنگی پڑے گی اور بیماری بہت بڑھے گی"۔[۱۲]

آج کے دور میں لکھے جانے والے کالموں میں بھی خبر کے ساتھ ساتھ اِسی طرح سے تبصرہ اور ذاتی رائے پیش کی جاتی ہے جیسا کہ "جامِ جہاں نما" میں اُس دور میں مروج تھا۔ اسی طرح ڈاکٹر عبد السلام خورشید کے مطابق "جامِ جہاں نما" میں ایک اور خبر کچھ یوں بیان ہوئی ہے:

"بہت دنوں سے یہ خبر مشہور تھی کہ انگلستان میں ایک جہاز تیار ہوتا تھا، کہ جس طرح ایک ناؤ پچھلے برس کلکتہ میں آئی کہ دھوئیں کے زور سے چڑھاؤ اتار پر بے تکلف دریا میں چلی آتی ہے، وہ جہاز اِس طرح بے کھٹکے، بحرِ محیط میں آمد و شد کرے گا اور اُس جہاز کے بنانے والے نے انگلینڈ سے کلکتے پہنچنے کی پچھہتر دن کی مدت ٹھیرائی ہے۔ کس واسطے کے وہ جہاز پال سے علاقہ نہیں رکھتا، جو ہوا کا محتاج ہو۔ اُس کو آندھی، طوفان، موسم، غیر موسم سب برابر ہے۔ بارے پچھلے ہفتے میں وہ جہاز ولایت سے آیا۔ جس دن وہ کلکتہ پہنچا دریا کے کنارے ایک انبوہ جمع تھا۔ ہفت اقلیم کے سیاح اکٹھے ہوئے تھے۔ کس واسطے کہ اگلے زمانے میں کسو نے جہاز کا نام نہیں سنا ہے"۔[۱۳]

اگر ہم درج بالا خبروں کا تفصیلی جائزہ لیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ بظاہر تو یہ اردو کے پہلے اخبار "جامِ جہاں نما" کی خبریں ہیں مگر اِن خبروں کی زبان، اسلوب، طرزِ بیان اور تحریر کی شگفتگی، نیز "خبر نگار" کی ذاتی رائے اور تبصرے سے یہ کسی کالم کا حصہ معلوم ہوتی ہیں۔ پہلی خبر میں ہندو معاشرے میں پائی جانے والی ستی کی رسم کا ذکر خوب نمک مرچ لگا کر کیا گیا ہے اور خبریں بھی ایک نہیں، بلکہ دو ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ ستی کی رسم پر مختلف خبروں کے حوالے سے ایک کالم یا مضمون لکھ دیا گیا ہے۔ "خبر نگار" لکھتے ہوئے حیرت کا اظہار بھی کر رہا ہے اور اُس نے ستی ہوتی ہوئی عورتوں کے انجام کو بھی بڑے ڈرامائی انداز میں بیان کیا ہے۔ اِسی طرح دوسری خبر

میں بھاپ انجن سے چلنے والے جہاز کی ہندوستان آمد کو دلچسپ، ڈرامائی اور شگفتہ انداز سے، کچھ ایسے طریقے سے بیان کیا ہے کہ ایک دفعہ پڑھنے لگ جائیں تو مکمل پڑھے بغیر چھوڑ نہیں سکتے۔ یہی انداز کالم میں بھی اپنایا جاتا ہے۔ آج بھی اکثر کالم روزمرہ خبروں کو بنیاد بنا کر ہی لکھے جاتے ہیں۔ تاہم کالم نگار ان خبروں پر اپنی رائے کا اظہار اور تبصرہ کچھ ایسے دلچسپ اور خوب صورت انداز سے کرتا ہے کہ قاری خبر سے آگاہی حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ اُس کی تحریر سے بھی لطف اندوز ہوتا ہے۔ بعض کالم تو اتنے دلچسپ اور معیاری ہوتے ہیں کہ انھیں بار بار پڑھنے کو دل کرتا ہے۔ خبر نگاری کا یہ انداز صرف "جامِ جہاں نما" تک ہی محدود نہیں تھا بلکہ اُس کے بعد شائع ہونے والے دیگر اخبارات میں بھی خبروں کا یہی انداز اپنایا گیا ہے۔ اصل میں شروع کی اخبار نویسی میں اخبارات میں کوئی فیچر، اداریہ یا کالم تو چھپتا نہیں تھا، بس خبریں ہی ہوتی تھیں لیکن اخبار کا وقائع نگار یا ایڈیٹر خبر ہی ایسے انداز سے لکھتا تھا کہ خبر میں اُس کی ذاتی رائے اور تبصرہ بھی شامل ہو جاتے تھے یوں خبر مزید دلچسپ ہو جاتی تھی اور جس اخبار کی خبریں جتنی زیادہ دلچسپ ہوتیں، قارئین میں وہ اخبار بھی اُتنا ہی زیادہ مقبول ہوتا۔

مشہور کتاب "فیچر، کالم اور تبصرہ" کے مصنف محمد اسلم ڈوگر کالم کی ارتقائی منازل کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "برِصغیر میں اگر ہم کالم کے ارتقاء کا جائزہ لیں تو یہ ہمیں کئی تبدیلیوں سے گزرتا ہوا نظر آتا ہے۔ انیسویں صدی میں ہمیں کالم کی دو صورتیں نظر آتی ہیں۔ آغاز میں یہ خبری کالم تھا۔ تاہم اُن خبروں میں سے اکثر خبروں میں مزاحیہ کالم کی سی شگفتگی ملتی ہے۔ دوسرے دور میں کالم، کالمی مضامین کی صورت میں نمودار ہوا۔ اس کا آغاز "اودھ پنچ" نے کیا تھا۔ بیسویں صدی کے آغاز میں کالم نے ایک باقاعدہ صورت اختیار کی اور پھر یہ باقاعدہ ایک مستقل عنوان کے ساتھ اور کالم نویس کے نام کے ساتھ شائع ہونے لگا"۔[۱۴]

درج بالا مثالوں کی روشنی میں بلاشبہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اردو کالم کی موجودہ شکل و صورت نے ابتدائی دور کی خبروں ہی سے ارتقاء پایا ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ کالموں میں جدت و نکھار آتا چلا گیا اور آج اردو کالم موجودہ منزل تک پہنچ سکا۔ بقول شفیق جالندھری "جامِ جہاں نما" میں:

"کالم کا وجود اخبار کی خبروں اور مضامین کے اسلوب و بیان، مواد اور فکر و خیال میں یوں موجود تھا جیسے جسمِ انسانی کے رگ و ریشہ میں میں روح و جاں"۔ [۱۵]

"جامِ جہاں نما" کے بعد دوسرا اہم اخبار مولوی محمد باقر کا "دہلی اردو اخبار" تھا جو کہ ۱۸۳۷ء میں شروع ہوا۔ یہ دہلی کا پہلا اخبار تھا اور مولانا محمد حسین آزادِ سمیت بعض محققین اِسی کو اردو کا پہلا اخبار قرار دیتے ہیں۔ حالاں کہ تحقیق سے ثابت ہو چکا ہے کہ "جامِ جہاں نما" ہی اردو کا پہلا اخبار تھا۔ تاہم دہلی اردو اخبار کی خبروں کا انداز بھی وہی لگتا ہے جو "جامِ جہاں نما" کی خبروں کا تھا۔

محمد عتیق صدیقی اپنی کتاب میں اِس کے بارے میں بتاتے ہوئے نمونہ پیش کرتے ہیں:

"سنا گیا ہے کہ ان دنوں گز قاسم خان میں مرزا نوشہ کے مکان سے اکثر نامی قمار باز پکڑے گئے، مثلِ ہاشم خاں وغیرہ کے جو سابق بڑی علّتوں میں دورہ تک سپرد ہوئے تھے۔ بڑا قمار ہوتا تھا۔ لیکن بسب رعب و کثرت مردان کے یا کسی طرح سے کوئی تھانے دار دست انداز نہیں ہو سکتا تھا۔ اب تھوڑے دن ہوئے یہ تھانے دار قوم سے سیّد اور بہت جری سنا جاتا ہے مقرر ہوا ہے۔۔۔۔ یہ مرزا نوشہ ایک شاعر، نامی رئیس زادہ نواب شمس الدین قاتل ولیم فریزر کے قرابت قریبہ میں سے ہے۔ یقین ہے کہ تھانے دار کے پاس بہت رئیسوں کی سعی و سفارش بھی آئی لیکن اس نے دیانت کو کام فرمایا۔ سب کو گرفتار کیا عدالت سے جرمانہ علی قدر مراتب ہوا۔ مرزا پر سو روپے ادا نہ کریں تو چار مہینے قید۔ لیکن ان تھانے دار کی خدا خیر کرے۔ دیانت کو تو کام فرمایا انھوں نے لیکن اس علاقہ میں بہت رشتہ دار متمول اس رئیس کے ہیں، کچھ تعجب نہیں کہ وقت بے وقت چوٹ پھوٹ کریں اور یہ دیانت ان کی وبالِ جان ہو۔ حکام ایسے تھانے دار کو چاہیے کہ بہت عزیز رکھیں۔ ایسا آدمی کمیاب ہوتا ہے"۔ [۱۶]

مذکورہ خبر کی زبان سوائے ایک دو الفاظ کے عام فہم ہے۔اِس کا انداز بھی عام خبر ہی کی طرح لگتا ہے لیکن خبر نگار نے ذاتی رائے یا تبصرہ سے خبر کو مضمون یا کالم کا رنگ دے دیا ہے۔یہی نہیں تھانے دار کی تعریف و توصیف کے ساتھ ساتھ اس کی بہادری و جرأت مندی کے قصیدے بھی گائے گئے ہیں اور حکومت کو اس عظیم سپوت کی قدر و حفاظت کا مشورہ تک دے ڈالا ہے۔کوہ نور اخبار ۱۴ جنوری ۱۸۵۰ء کو لاہور سے شروع ہوا تھا۔اِس اخبار کو منشی ہر سکھ رائے نے جاری کیا تھا۔یہ اخبار اِس لیے اہم کہ یہ پنجاب کا پہلا اردو اخبار تھا۔ ڈاکٹر مسکین علی حجازی کے بقول:

""کوہ نور "پنجاب کا پہلا اخبار تھا"۔ [۷]

پنجاب کے بہت سے صحافی کوہ نور اخبار سے وابستہ رہے اور یہ اخبار تقریباً پچپن سال تک شائع ہوتا رہا۔کوہ نور میں خبریں جذباتی انداز سے شائع کی جاتی تھیں۔اِس اخبار کے بارے میں محمد عتیق صدیقی لکھتے ہیں:

"بجلی کی ڈاک کا تار لاہور تک بخوبی لگ گیا اور پرانے توپ خانہ کے ایک مکان میں اس کے کارخانے کا دفتر قائم ہوا ہے۔غالب ہے کہ صبح و شام میں اجراء پاوے۔اور پشاور تک بعد برسات کے جاری ہو گا۔سب سامان مہیا ہے۔تار کے انبار ڈاک خانہ میں لگ رہے ہیں اور پنجاب میں بڑی دھوم ہو رہی ہے۔کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔کوئی کہتا ہے کہ اس تار کے اوپر تھالی چلے گی۔کوئی خیال کرتا ہے کہ تھالی دوڑے گی۔مگر جب دیکھتے ہیں کہ دریا کے اوپر پہنچ کر تار کناروں پر زمین میں داب دیا گیا ہے اور دریا کے اندر پانی میں چلا گیا ہے اور دوسرے کنارے پر پھر نکل کر کڑے پر چڑھا دیا گیا ہے تو ان کی عقل خبط ہو جاتی ہے کہ یہاں تھالی تار پر کیوں کر چلے گی۔راقم اخبار کو اس امر کی تحقیقات کا بہت خیال ہے۔اکثر صاحب لوگوں سے دریافت کیا پر کچھ مطابقت نہیں ملی۔کسی نے کچھ کہا، کسی نے کچھ فرمایا ابھی کچھ معلوم نہیں ہے کہ بجلی کی ڈاک کیوں کر چلے گی۔اور کلکتہ بمبئی کی خبر لاہور یا پشاور تک ایک ہی دن میں کیوں کر پہنچے گی۔بڑی مشکل یہ ہے کہ اہالی اس کارخانے کے تماشائیوں کو داخل بالکل نہیں ہونے دیتے۔مگر غالب ہے کہ جب لاہور میں یہ کارخانہ اجراء

پاوے گا تو حال مفصل اس کو معلوم ہو جاوے گا۔اُس وقت مفصل حوالہ قلم کیا جاوے گا"۔[۱۸]

اگر ہم اُس دور کے دیگر اخبارات کا جائزہ لیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ اُس دور کے دیگر اخبارات بھی ایسی ہی خبروں سے بھرے پڑے ہیں۔ اُس دور کے اہم اخبارات میں "جامِ جہاں نما ۱۸۲۲ء"، "دہلی اردو اخبار ۱۸۳۶ء"، سر سیّد احمد خان کے بھائی سیّد محمد خان کا "سیّد الاخبار ۱۸۳۷ء"، دہلی کالج کے پروفیسر کریم الدین کا "کریم الاخبار ۱۸۴۵ء"، لاہور سے پہلا اردو اخبار "کوہ نور ۱۸۵۰ء"، لکھنؤ کے اخبارات "طلسم لکھنؤ" اور "سحر سامری" شامل تھے۔ اِن تمام اخبارات میں خبروں کا لگ بھگ وہی ایک جیسا انداز تھا جو اُس دور میں مروج تھا اور جس کی مثالیں پہلے دی جا چکی ہیں۔ یہ تمام اخبارات ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی سے پہلے کے ہیں۔ اِس میں کالم اپنی موجودہ شکل میں کہیں بھی دکھائی نہیں دیتا ہے تاہم اپنے جواں سال بھائی سیّد محمد خان کی اچانک وفات کے بعد سر سیّد احمد خان نے ۱۸۴۶ء میں "سیّد الاخبار" کا انتظام اپنے ہاتھ میں لیا تو اِسی اخبار سے اپنی مضمون نویسی کا آغاز کیا۔ سر سیّد نے اِس اخبار میں متعدد اخلاقی، علمی، مذہبی اور تاریخی کالم نما مضامین لکھے تاہم یہ مضامین سر سیّد احمد خان کے بعد ازاں "تہذیب الاخلاق" اور "سائنٹیفک سوسائٹی" میں لکھے گئے مضامین کی طرح کالم سے زیادہ اداریے کے قریب سمجھے جاتے ہیں۔ اسی طرح دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ جنگِ آزادی کے بعد زیادہ اردو اخبارات بند ہو گئے تھے اور جو بند نہیں ہوئے تھے وہ بھی پہلے جیسے نہیں رہ سکے، اُن کا رنگ ڈھنگ ہی بدل گیا تھا۔ تاہم بعد میں ۱۸۵۸ء میں منشی نول کشور نے "اودھ اخبار" جاری کر کے اردو صحافت کی ڈوبتی کشتی کو نہ صرف سہارا دیا بلکہ اِسے ترقی کے بامِ عروج تک پہنچانے میں بڑا اہم کردار بھی ادا کیا۔ یہ اخبار منشی نول کشور کی تین نسلوں کی سرپرستی میں تقریباً نوے سال تک چھپتا رہا۔ اِس اخبار کی خصوصیت یہ تھی کہ اِس نے اردو میں جدید صحافت کا دروازہ کھولا۔ یہ اردو کا پہلا روزنامہ تھا کہ جس میں ہر موضوع پر علمی، ادبی، مذہبی، فلسفیانہ، معاشی اور معاشرتی مضامین نیز مقالے چھپتے تھے جنھیں ابتدائی نوعیت کے کالم بھی کہا جا سکتا ہے اور ظرافت کے مستقل عنوان سے "اودھ اخبار" میں پنڈت رتن ناتھ سرشار کے چھپنے والے مضامین کو اوّلین کالم بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ سرشار کی لکھنؤ کی معاشرتی زندگی اور اُس کے رسوم و

رواج پر ہلکے پھلکے انداز میں لکھی گئی دلچسپ تحریریں ہی بعد ازاں " فسانہء آزاد" کی شکل اختیار کر گئیں۔ "اودھ اخبار" ہی میں مولانا عبدالحلیم شرر نے اوائل عمری میں مضامین لکھے جو بے حد مقبول ہوئے۔ یہ وہ اخبار ہے جس کی تعریف سر سیّد احمد خان نے بار بار کی۔ اردو زبان کے اِس اخبار نے اُس دور میں بین الاقوامی شہرت حاصل کی جب اردو کا بلاشبہ ابتدائی زمانہ تھا۔ اِس لحاظ سے یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ "اودھ اخبار" اردو زبان کا وہ پہلا اخبار تھا کہ جس کو بین الاقوامی سطح پر بھی پذیرائی ملی۔ "اودھ اخبار" کا دور پنچ اخباروں کا دور بھی تھا۔ یہ تمام اخبارات مزاحیہ صحافت کے حامل تھے۔ ہندوستان میں مزاحیہ اخبار نویسی کی اپنی ایک تاریخ ہے۔ ۱۸۵۵ء میں رام پور سے نکلنے والے اخبار "مذاق" کو اردو مزاحیہ صحافت کا پہلا اخبار سمجھا جاتا ہے۔ اِس کے بعد ہندوستان کا پہلا پنچ اخبار ۱۸۵۹ء میں "مدراس پن" کے نام سے جاری ہوا۔ اِسی طرح ۱۸۷۶ء میں بمبئی سے "حرمت الاخبار" اور مراد آباد سے "روہیل کھنڈ پنچ" اور پٹنہ سے "بہار پنچ" جاری ہوئے جب کہ اگلے سال ۱۸۷۷ء میں مزاحیہ صحافت کا سب سے بڑا سرخیل سمجھا جانے والا اخبار "اودھ پنچ" جاری ہوا۔ "اودھ پنچ" ہر اعتبار سے ایک بڑا اور معیاری اخبار سمجھا جاتا ہے۔ اخبار بیں طبقہ کی اکثریت نہ صرف اِسے پڑھتی تھی بلکہ اِس میں چھپنے والے طنز و مزاح کو بھی بہت پسند کیا جاتا تھا۔ اِس اخبار میں مسلسل اور باقاعدہ لکھنے والوں میں پنڈت رتن ناتھ سرشار، مرزا مچھو بیگ (اصل نام محمد مرتضےٰ تھا) نواب سیّد محمد آزاد، اکبر الہ آبادی، پنڈت تربھون ناتھ ہجر اور منشی جوالا پرشاد برق جیسے نابغہء روزگار شاعر اور نثر نگار شامل تھے۔ ہندوستان میں پنچ اخباروں کا رواج لندن کے مشہور مزاحیہ اخبار "لندن پنچ" کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے ہوا تھا۔ تاہم "اودھ پنچ" کو اکبر الہ آبادی "لندن پنچ" سے بھی زیادہ بہتر اخبار قرار دیتے تھے۔ اُن کے بقول:

؎ "ہر چند کہ طرز پنچ لندن بے شبہ ہے دل پسند و پُر فن
لیکن وہ نقشِ اوّلین ہے نسبت اس سے اسے نہیں ہے
ماشاءاللہ یہ نقشِ ثانی بہتر ہے بہ صورت و معانی " [۱۹]

اخبار "اودھ پنچ" ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کی شکست کے تقریباً بیس سال بعد جاری ہوا تھا۔ اُس عہد میں ہندوستان کے مسلمانوں پر جو گزر رہی تھی، اُس سے ساری مسلم قوم کو ایک گہرے کرب اور شدید صدمے

سے دوچار کر رکھا تھا۔ علم و ادب کی محفلوں میں رنجیدگی اور سنجیدگی کا امتزاج ملتا تھا۔ اِن کٹھن حالات میں اخبار "اودھ پنچ" نے طنز و مزاح کی پھلجھڑیاں چھوڑ کر سنجیدگی سے مکدر ہوتی فضا کو ہلکا پھلکا کرنے اور رنجیدگی کا تاثر مدھم کرنے کی کوشش کی۔ بلاشبہ یہ کوشش بڑی کامیاب ثابت ہوئی۔ اِس کی مقبولیت کا اندازہ اِس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ "اودھ پنچ" میں چھپنے والے مضامین کے مزاحیہ اور طنزیہ فقرے دور دور تک مشہور ہو جاتے اور زبان زدِ عام رہتے۔ تاہم یہ بھی درست ہے کہ "اودھ پنچ" کے لکھاریوں کا طنز و مزاح اعتدال کی حدود سے نکل کر پھکڑ پن کے احاطے میں جا داخل ہوتا تھا۔ اِسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اُس زمانے کے اکثر اخبار، خاص طور پر سر سیّد احمد خان کے اخبار اور اودھ اخبار حکومت اور اُس کی پالیسیوں پر کھلم کھلا تنقید کرنے سے گریز کی پالیسی کے قائل تھے اور صرف یہی نہیں بلکہ مغربی تعلیم اور مغربی معاشرت کی تعریف و توصیف بھی اُن کا بنیادی وصف تھا لیکن اِس کے برعکس "اودھ پنچ" اخبار انگریزی اور دیسی حکمران طبقے پر بے باکانہ نکتہ چینی کرنے کی پالیسی رکھتا تھا نیز مغربی تہذیب کی مخالفت بھی اس کی تحریروں کا لازمی جزو ہوتا تھا۔ ظفر علی ظفری کے مطابق ہندوستان میں مغربی تعلیم کو نئی روشنی قرار دے کر مشرقی طرزِ رہن سہن اور رسوم و رواج کو جہالت قرار دینے والے ریفارمرز پر اپنے ایک مضمون میں اخبار "اودھ پنچ" لکھتا ہے:

> "یہ اوندھی کھوپڑی والے پرانی روشنی کے ٹمٹماتے ہوئے چراغ سمجھے بیٹھے ہیں کہ پیری مریدی کا گورکھ دھندا صرف ہمارے ہی یہاں ہے۔ نہیں! نئی روشنی والے بھی بیعت کرتے ہیں۔ ہم نے کانوں سے باتفصیل وہ مدارج سنے ہیں جو ایک پیر پادری اور ان کے مرید سے طے ہوئے، شیک ہینڈ کرتا ہوں کہ تجاویز نہ کروں گا، ایک قدم بھی اس راستے سے جو راستہ میرا ریفارمر مجھے بتلائے (چاہے وہ جہنم کا راستہ ہو) نہ واسطہ رکھوں گا، دین اور ایمان اور کل مذہبی خیالات سے کسی طرح۔ مقدم سمجھوں گا خوشنودی یورپ والوں کی خدا کی خوشنودی پر، تعمیل کروں گا اس کے احکام کی احکامِ الٰہی کو چھوڑ کر، نہ فرق کروں گا حلال و حرام میں، قولاً ہو یا فعلاً نہ گرد پھٹکوں گا ان پرانے ڈھکوسلوں کے جن کا فرض یا واجب یا سنت یا مستحب کہتے

ہیں۔۔۔ جھٹلاؤں گا حدیثوں کو۔۔۔ باطل سمجھوں گا اس کلام کو جس کو نادان اللہ کا کلام سمجھتے ہیں۔ حقیر سمجھوں گا ان لوگوں کو جو پابند ہوں گے مذہب کے۔۔۔ پلٹا دوں گا قرآن اور حدیث کے معنی کو۔۔۔ موتوں گا سیدھا کھڑا ہو کر اور پاک سمجھوں گا ان چھینٹوں کو جو زمین سے اُڑ کر منہ پر پڑیں۔ دریغ نہ کروں گا بنیادِ اسلام کے کھدوانے میں چاہے مسجد ہو۔ منہ چوموں گا کتوں کا طاہر جان کر۔۔۔ شراب پیوں گا رمضان کے مہینے میں فرض کر کے۔ کلمہ پڑھوں گا اہلِ یورپ کا اسلام کے بدلے۔ گیند یا کرکٹ کھیلوں گا نماز کے بدلے۔ لندن شریف کی زیارت کروں گا حج کے بدلے۔ تبرک سمجھوں گا اس کھانے کو جو جھوٹا ہو کسی انگریز کا۔ اے میرے ریفارمر اگر لڑکھڑائیں میرے قدم اِن راہوں پر چلتے ہوئے تو انجام میرا ہو ساتھ پرانی روشنی والوں کے اور نہ نصیب ہو مجھ کو اس پاک چیز کا جو بکسوں میں بند ہو کر ولایت سے آتی ہیں"۔[۲۰]

اس طرح کی بے شمار کڑوی کسیلی تحریریں اخبار "اودھ پنچ" میں شامل ہوتی رہی ہیں۔ اس اخبار کے بانی اور طویل عرصے تک بطورِ مدیرِ اعلیٰ کام کرنے والے منشی سجاد حسین نے انگریزوں کی اس غلامی کے دور میں کہ جب حکمرانوں پر تنقید کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا اپنے اخبار میں یہ طریقہ اختیار کیا کہ بات کو طنز و مزاح کے پردے میں بیان کرتے تھے تاہم اردو صحافت اور اردو زبان و ادب کو اِس سے یہ فائدہ ہوا کہ اِس سے اردو میں باقاعدہ کالم نگاری کا آغاز ہو گیا۔ ڈاکٹر وزیر آغا اِس بارے میں لکھتے ہیں:

"اردو صحافت میں اودھ پنچ کی اہمیت کی تین وجوہ ہیں، پہلی تو یہ کہ "اودھ پنچ" نہ صرف اردو کا پہلا مزاحیہ اخبار تھا بلکہ اس نے پہلی بار اردو میں مغربی طنز و مزاح کے طریقوں کا بھی استعمال کیا۔ دوسری یہ کہ سیاسی اور مجلسی مسائل پر بھرپور طنز کا آغاز "اودھ پنچ" ہی سے ہوا۔ "اودھ پنچ" سے پہلے محض سرسری سی نکتہ چینی یا ایک حد تک تنقید ضرور موجود ہوتی تھی لیکن ظرافت کے بیشتر عناصر کا افسوس ناک حد تک فقدان تھا۔ تیسری یہ کہ "اودھ پنچ" وہ پہلا اردو اخبار تھا کہ جس نے کسی خاص واقعے

کے متعلق اپنی رائے دینے یا کسی چیز کے مضحکہ خیز پہلو کو نمایاں کر کے پیش کرنے یا
محض حریف کو ذلیل کرنے کے لئے کارٹون کا استعمال بھی کیا"۔[۲۱]

اگرچہ یہ بات سچ ہے کہ اُس دور کی سنجیدہ اخباری دنیا نے "اودھ پنچ" کو زیادہ پذیرائی نہ دی اور اس کو کافی تنقید کا نشانہ بھی بنایا مگر اردو زبان و ادب، اردو طنز و مزاح اور خصوصاً اردو کالم نگاری کی جو خدمت "اودھ پنچ" نے کی، اُسے ہر گز ہر گز نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ محض پھکڑ پن، بازاری جملے اور اخلاق سے گرے لطیفوں کا اخبار نہیں تھا بلکہ اس کی تحریروں کا مقصد اصلاحِ احوال تھا۔ عام قاری اِس اخبار کی تحریریں پڑھ کر محظوظ تو ہوتے ہی تھے مگر ساتھ ساتھ انھیں زندگی کے مختلف شعبوں کے بارے میں بہت کچھ سمجھنے اور سیکھنے کا موقع بھی ملتا تھا۔ یوں ہم بلاشبہ یہ کہ سکتے ہیں کہ "اودھ پنچ" اخبار نے پبلک کے صرف سماجی ہی نہیں بلکہ سیاسی شعور کو بھی بلند کرنے میں نمایاں ترین خدمات سر انجام دی ہیں اور اِس اخبار نے اردو زبان و ادب اور صحافت کی بنیادوں کو سینچنے کا حق بھی بخوبی ادا کیا ہے۔ یوں اردو کالم نگاری کی تاریخ میں "اودھ پنچ" اخبار کو سنگِ میل کی حیثیت دی جا سکتی ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے بقول:

> ""اودھ پنچ" اپنی طرز کا پہلا اخبار تھا اور اس کی مقبولیت کا اندازہ محض اس بات سے ممکن ہے کہ یہ اخبار ایک باقاعدہ تحریک کا پیش رو ثابت ہوا اور دیکھتے دیکھتے ہندوستان بھر میں پنچی اخبارات کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ اِس سلسلے کے بے شمار اخبارات میں سے کسی بھی اخبار کو وہ مقبولیت نصیب نہ ہو سکی جو "اودھ پنچ" کو حاصل تھی۔ جہاں تک صحافت میں طنز و مزاح کا تعلق ہے یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ "اودھ پنچ" کو اِس شعبے میں پہلے سنگِ میل کا درجہ حاصل ہے"۔[۲۲]

سر سیّد احمد خان کا پہلا اخبار "علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ" مارچ ۱۸۶۶ء کو جاری ہوا ہے۔ یہ اخبار "اودھ اخبار" اور اخبار "اودھ پنچ" کی طرح مستقل عنوان کے تحت کالم شائع نہیں کرتا تھا لیکن اِس میں سر سیّد احمد خان خود سیاسی معاملات سے متعلق بڑے اعلیٰ پائے کے مضامین لکھا کرتے تھے۔ اِس اخبار میں سیاسی موضوعات کے

علاوہ اخلاقی، سماجی اور علمی موضوعات پر طبع زاد مضامین شائع کئے جاتے اور ساتھ ہی انگریزی اخباروں کے اچھے اور مؤثر مضامین بھی ترجمہ کر کے شائع کیے جاتے تھے۔ بے شک ہم انھیں معروف معنوں میں کالم نہیں کہہ سکتے لیکن اُس دور میں سنجیدہ موضوعات پر لکھے گئے یہ مضامین آنے والے وقتوں میں سنجیدہ موضوعات پر کالم لکھنے والوں کے لیے مشعلِ راہ کا کام دیتے ہیں۔

سر سیّد احمد خان اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں :

"جس طرح کل ہندوستان کا سپید رنگ ہو جانا اور ہر ایک ہندوستانی کا کوٹ پتلون پہن لینا اور ہندوستانی عورتوں کو انگریزی لباس زیب تن کر کے بے پردہ گلی در گلی پھرنا دشوار ہے، اِسی طرح ہندوستانیوں کی تہذیب اور شائستگی، صاحبانِ یورپ کے دل نشین ہو جانا بھی محال ہے۔ ہندوستانی کتنے ہی علوم و فنون میں کمال حاصل کریں اور کتنے ہی دیانت دار اور خوش کردار ہو جائیں، مگر وہ انگریزوں کے نزدیک بے ایمان اور غیر مہذب ہی رہیں گے اور انگریز چاہے جتنی بد افعالیاں کر لیں، مگر وہ شریف کے شریف ہی ہیں۔ ایک سڑے سے سڑا گورا، آوارہ پھرنے والا بھی جنٹل مین ہے۔۔۔

"ہندو پٹریاٹ" کا یہ تکیہ کلام بالکل سچ ہے کہ کالا ہونا بڑا جرم ہے"۔[۲۳]

یہ تحریر سر سیّد کے ایک اخباری مضمون سے لی گئی ہے۔ اِس کا انداز اور اسلوب آج لکھنے والے سنجیدہ سیاسی کالموں سے ذرا مختلف نہیں اِس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ سر سیّد کے مضامین آج کے سنجیدہ سیاسی کالموں کی ابتدائی صورت تھے۔ سر سیّد احمد خان کا دوسرا اخبار "تہذیب الاخلاق" ۱۸۷۰ء میں شائع ہونا شروع ہوا۔ اس کا انگریزی نام "دی محمڈن سوشل ریفارمر" تھا۔ "اخبار سائنٹیفک سوسائٹی" (علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ) کے برعکس "تہذیب الاخلاق" سارے کا سارا اردو میں شائع ہوتا تھا۔ اِس اخبار کا پہلا اور آخری مقصد سماجی اصلاح تھا۔ سر سیّد نے اِس کے پہلے ہی پرچے میں لکھا تھا کہ "تہذیب الاخلاق" کا مقصد ہندوستان کے مسلمانوں کو اعلیٰ درجے کی تہذیب اختیار کرنے کی طرف راغب کرنا ہے۔ سال ہا سال تک سر سیّد احمد خان نے اِس اخبار

میں ہندوستان کے مسلمان معاشرے کی اصلاح کے لیے مضامین لکھے اور یہ مضامین اتنے شاندار اور پُر اثر ہوتے تھے کہ جو کوئی بھی ان کو پڑھتا متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتا۔ سر سیّد احمد خان کے اخبارات اور ان میں چھپنے والے اُن کے اور اُن کے رفقاء کے مضامین جنھیں ہم ذاتی کالم بھی کہہ سکتے ہیں، اردو کالم نگاری کی جڑوں کو سینچنے میں بے حد معاون ثابت ہوئے۔ اگر ہم دورِ جدید کے اخبارات کا جائزہ لیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ اردو اخباروں میں آج کل بھی زیادہ تر سیاسی کالم ہی شائع ہوتے ہیں، جن کا لب و لہجہ سنجیدہ اور مقصد حکومتِ وقت کی پالیسیوں پر تنقید، اُن کی تشریح و تفسیر اور متوقع اثرات کا جائزہ، عوام الناس کے مصائب و مسائل کا ذکر اور حکومتی توجہ اُن کی طرف مبذول کرانے کی کوشش ہوتا ہے۔ اردو میں ایسے کالموں کی ابتدا اگرچہ سر سیّد احمد خان کے سیاسی، معاشرتی اور اصلاحی مضامین سے ہوتی ہوئی دکھائی دیتی ہے مگر یہ محض ابتدا تھی۔ اُسی دور کے دو اور اخبار "اخبارِ عام" اور "پیسہ اخبار" بھی ہیں جو اگرچہ کالم نگاری کے حوالے سے قابلِ ذکر نہیں تاہم ان کی عوامی پذیرائی اور خبروں اور اداریوں کی وجہ سے ان کو ابتدائی کالم نگاری کے ارتقاء میں معاون نہ سمجھنا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔

> "ڈاکٹر عبد السلام خورشید نے ان دونوں اخباروں کو جدید صحافت کا علمبردار قرار دیا ہے"۔ [۲۴]

اُس دور میں مولوی محبوب عالم، سر سیّد احمد خان، مولانا ظفر علی خان، مولانا محمد علی جوہر، مولانا عبد المجید سالک، مولانا حسرت موہانی، مولانا شبلی نعمانی، حمید نظامی، مولانا چراغ حسن حسرت، مولانا عبد الماجد دریا آبادی، مولانا ابو الکلام آزاد، مولانا غلام رسول مہر اور حاجی لق لق جیسے اہلِ قلم پیدا ہوئے، جن کی معیاری اور شگفتہ تحریروں نے کالم نگاری کو چار چاند لگا دیئے۔ اردو صحافت کے کارواں کو کامیابی سے آگے بڑھانے میں ان بزرگوں نے گراں قدر خدمات سر انجام دی ہیں۔ اِن حضرات کی کالمی اور غیر کالمی تحریروں نے ایک طرف اردو زبان و ادب کی بیش بہا خدمت کی جب کہ دوسری طرف اردو کالم کو مزید واضح شکل اور زیادہ بہتر صورت میں پیش کیا۔

مولانا عبد الکلام آزاد اعلیٰ پائے کے صحافی، عالمِ دین اور سیاست دان تھے۔ صحافی اور صحافت کے متعلق ان کے نظریات بڑے واضح تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اخبار نویس کو غیر جانب دار، ایمان دار اور سچائی کا بول بالا کرنے والا ہونا چاہیے نہ کہ ایمان فروش اور ضمیر فروش۔ مولانا آزاد نے ۱۹۱۲ء میں اپنا مشہور اخبار "الہلال" نکالا، جو پہلے ہفت روزہ، پھر سہ روزہ اور بعد ازاں روزنامہ بھی رہا۔ اِس اخبار میں مولانا کا فکاہیہ کالم 'افکار و حوادث" چھپا کرتا تھا۔ مولانا کے کالم کو سنجیدہ صحافت میں پہلا باقاعدہ عنوان کے تحت لکھا جانے والا کالم سمجھا جاتا ہے جِس کا اسلوبِ بیاں نہایت پر جوش اور مؤثر تھا۔ ایک محقق قطب اللہ نے اپنی کتاب مولانا آزاد کا نظریہ صحافت میں لکھا ہے کہ یہی اردو کا پہلا باقاعدہ جدید انداز کا کالم تھا۔ اردو کے اوائل دور کا ایک اور قابلِ ذکر اخبار مولانا محمد علی جوہر کا "ہمدرد" اخبار ہے۔ اِس کا اجراء فروری ۱۹۱۳ء میں دہلی سے ہوا۔ یہ دور "زمیندار" کے عروج کا دور تھا، مگر اس کے باوجود "ہمدرد کو علمی اور صحافتی حلقوں میں خوب پذیرائی ملی۔ مولانا محمد علی جوہر نے صحافت میں جارحانہ انداز اپنانے کی بجائے غیر جانبدارانہ روّیہ اختیار کیا۔ ان کی تحریروں کی زبان بھی نہایت سادہ اور سلیس ہوتی، وُہ بھاری بھر کم الفاظ و محاورات اور مقفیٰ و مسجّع عبارت آرائی سے مکمل اعتراز کرتے تھے۔ "ہمدرد" میں ان کے کالم کا عنوان "کشکول" تھا۔ وہ اپنے اس کالم کے ذریعے عوام کے دلوں کو گرماتے، انگریزوں پر تنقید کرتے اور ہم عصروں سے چھیڑ چھاڑ کرتے تھے۔ بقول مشتاق صدف مولانا محمد علی جوہر اپنے کالم میں لکھتے ہیں:

> "اگر یونین جیک کے جھنڈے کے نیچے گورنمنٹ ہند کی نظر کے سامنے اور ہماری آنکھوں کے روبرو ہمارے بھائیوں کی تذلیل و تحقیر ہو گی، ہمارے بھائیوں کی بیویوں کی بے حرمتی ہو گی، ہمارے بھائیوں کے بچوں سے جیل خانوں میں پہل کی جائے گی، صرف اس بنا پر کہ ہم کالے ہیں اور وہ گورے ہیں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ وزارت کے اقتدار کو اس قدر صدمہ پہنچے گا کہ جس کی تلافی مشکل ہو گی اور اس کے ایسے نتائج نکلنے کا اندیشہ ہے جس کو کوئی بہی خواہ بھی مستحق قرار دے سکتا ہے"۔[۲۵]

مولانا عبد المجید سالک اخباری کالم میں شائستہ طنز و مزاح کے بانی ہیں۔ انھوں نے عامیانہ پن اور پھکڑ پن سے فکاہی کالم کو آزاد کیا اور اپنی تحریر میں شرافت اور شائستگی کے ساتھ ادبی چاشنی بھی پیدا کی۔ مولانا سالک کے " افکار و حوادث " کے ابتدائی سالوں کے ایک کالم کی مثال پیش ہے کہ ہمارے ہاں گاندھی سا بڈھا آدمی لنگوٹی باندھ کر پھرے تو مغرب کے مرد و زن اسے وحشی قرار دیں، لیکن مغرب کی خوش چشم خواتین عورت ذات ہو کر لنگوٹی باندھ لیں تو ان کی یہ حرکت حسن و مذاق، شائستگی اور تہذیب کی جان سمجھی جائے۔

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

مولانا سالک کا اسلوب ہر لحاظ سے ادبی تھا، یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریر کی تازگی آج بھی برقرار ہے اور آج کا قاری بھی ان کے اکثر کالموں سے اتنا ہی لطف اندوز ہوتا ہے جتنا کہ ان کے اپنے دور کا۔ انھوں نے ہر موضوع پر قلم اٹھایا اور پورا پورا انصاف کیا۔ جہاں جہاں ان کو کچھ غلط دکھائی دیا انھوں نے اُس پر بے لاگ تبصرہ کیا۔ سالک کی تحریروں سے ان کی حب الوطنی، اسلام پسندی، قومی غیرت و حمیت اور غیر ملکی انگریز آقاؤں سے بے زاری صاف چھلکتی نظر آتی ہے۔

اردو کالم کے ارتقاء میں سالک کے بعد دوسری بڑی شخصیت چراغ حسن حسرت کی ہے۔ اردو کالم نگاری کی روایت کو پختہ تر کرنے میں مولانا عبد المجید سالک اور مولانا چراغ حسن حسرت کا کردار اتنا زیادہ اہم ہے کہ اردو کالم کے سکے کے ایک رخ پر ایک کی اور دوسرے رخ پر دوسرے کی تصویر کنندہ دکھائی دیتی ہے۔ دونوں کی قدرِ مشترک شائستگی اور ادبی چاشنی ہے جو ان دونوں کی کالمی تحریروں میں نمایاں دکھائی دیتی ہے۔ حسرت نے ۱۹۳۵ء میں کلکتہ کے مشہور ادبی رسالے "عصرِ جدید" میں سب ایڈیٹر کی حیثیت سے ملازمت کا آغاز کیا۔ حسرت نے بہت سے قلمی ناموں سے لکھا، تاہم ان کا قلمی نام "سند باد جہازی" بہت زیادہ مشہور ہوا جو وہ روزنامہ "احسان" میں "مطائبات" کے مستقل عنوان سے کالم لکھنے کے لیے استعمال کرتے تھے۔ حسرت ہلکے پھلکے انداز میں واقعات بیان کرتے اور گویا مزاح کی پھلجھڑیاں چھوڑتے۔ ان کے ہاں مزاح زیادہ اور طنز کم ملتا ہے۔ تاہم سیاسی اور معاشرتی مسائل پر طنز کرتے ہوئے بھی ان کی تحریر میں کہیں تلخی یا غصہ نام کو نظر نہیں

آتا۔ان کا ادبی ذوق بہت گہرا اور مطالعہ بڑا وسیع تھا۔ ان کی تحریر میں ادبی حوالے جابجا ملتے ہیں۔ڈاکٹر شفیق جالندھری ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "حسرت کے کالم روزانہ صحافت کا حصہ تھے لیکن ادب میں ان کا اپنا مقام ہے۔ان کی قلم برداشتہ تحریریں بھی زبان و بیان کے حسن اور ندرتِ خیال کی خوبی رکھتی ہیں۔ان کے کالم بناوٹ اور تصنع سے پاک اور سلاست و روانی اور بے ساختگی کی عمدہ نظیر ہیں"۔[۲۶]

اُس دور کی اردو کالم نگاری کی روایت کو آگے بڑھانے میں مجید لاہوری اور حاجی لق لق کا کردار بھی بڑا نمایاں اور قابلِ ذکر ہے۔حاجی لق لق نے انگریزی فوج سے ریٹائرمنٹ کے بعد ۱۹۳۲ء میں اپنی کالم نویسی کا آغاز کیا۔ان کا اصل نام عطا محمد تھا۔ مختلف اخبارات ورسائل میں کالم لکھتے رہے۔"زمیندار" میں "فکاہات" کے نام سے کالم لکھتے تھے۔شاعری کا ذوق بھی رکھتے تھے اور متعدد کتب بھی تصنیف کی ہیں۔ مجید لاہوری کا اصل نام مجید چوہان تھا۔قیامِ پاکستان سے کچھ عرصہ قبل انھوں نے کالم نویسی شروع کی تھی۔ قیامِ پاکستان کے بعد روزنامہ "جنگ" کراچی سے "حرف و حکایت" کے مستقل عنوان سے کالم لکھتے رہے۔ان کے کالم عوام کے دل کی آواز ہوتے تھے اور وہ عوام کی سوچ اور فکر کی بھرپور عکاسی کرتے تھے۔ان کی تحریر سادہ اور عام فہم ہوتی اور ان کے کالم کے موضوعات بھی عام آدمی کی زندگی سے لیے جاتے تھے۔یہی وجہ ہے کہ قارئین کا ایک وسیع حلقہ ان کے کالم کا منتظر رہتا تھا۔شفیق جالندھری نے مجید لاہوری کے متعلق آغا شورش کاشمیری کا مندرجہ ذیل تبصرہ نقل کیا ہے:

> "وہ ادبی انداز کے نقطہ آفرین نہیں تھے لیکن بات سے بات اٹھا کر مزاح پیدا کرتے،ان کا طرزِ سخن،طرزِ مزاح ہمعصروں سے مختلف تھا۔کچھ لفظ تھے جن سے انھیں لگاؤ تھا،ان کے کردار بھی خاص لوگ تھے۔جن کی آڑ میں وہ معاشرے کے مختلف لوگوں پر حملہ آور ہوتے اور طعن کرتے تھے۔۔۔چھوٹے چھوٹے جملے، ہلکا پھلکا انداز، میٹھا میٹھا مزاح اور دھیمی دھیمی طنز گویا ان کی تحریر کا ضمیر و فطیر

تھا۔۔۔وہ کتابوں کے بجائے محفلوں کے مطالعہ و مشاہدہ کی بنا پر لکھتے تھے، قدما سے
کچھ زیادہ شناسا نہیں تھے"۔[۲۷]

اس دور کے ایک اور نمایاں کالم نگار شوکت تھانوی تھے۔ انھوں نے تقریباً نصف صدی کالم نویسی کی اور مختلف اخبارات و رسائل میں لکھتے رہے۔ ان کا اصل نام محمد عمر تھا۔ انھوں نے ہر قسم کے مسائل پر قلم اٹھایا اور عام آدمی کو درپیش زندگی کے گوناگوں مسائل کی سچی اور کھری تصویر کشی کی۔

اگر ہم عصرِ حاضر کے کالم نگاروں کا جائزہ لیں تو اِن میں کئی بڑے نام ہمیں نظر آتے ہیں، اِن میں ایک اہم نام امجد اسلام امجد کا بھی ہے جو اردو کے معروف شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ بہت اچھے کالم نگار بھی ہیں، انھوں نے ۱۹۸۴ء میں "چشم تماشا" کے عنوان سے روزنامہ "امروز" سے کالم نگاری کی ابتدا کی، بعد ازاں روزنامہ جنگ اور روزنامہ ایکسپریس اور آخر میں "روزنامہ جناح" میں "ساتواں در" کے نام سے اپنا کالم لکھتے رہے ہیں اور آج کل "چشم تماشا" کے عنوان سے روزنامہ "ایکسپریس" میں اپنا کالم لکھتے ہیں۔ اسی طرح عصرِ حاضر کے مقبول کالم نگاروں میں ایک اور اہم نام مشہور شاعر، ادیب، سفر نامہ نگار اور ڈرامہ نگار عطا الحق قاسمی کا بھی ہے، وہ گزشتہ تین دہائیوں سے کالم لکھ رہے ہیں اور آج کل وہ روزنامہ "جنگ" میں "روزنِ دیوار سے" کے مستقل عنوان سے اپنا کالم لکھ رہے ہیں، اُن کے کالم ظرافت اور طنز و مزاح سے بھرپور ہونے کی وجہ سے بہت زیادہ مقبول ہیں۔ اسی طرح عصرِ حاضر کے مقبول ترین کالم نگاروں میں ایک اور اہم اور کامیاب نام جاوید چودھری کا بھی ہے، انھوں نے جولائی ۱۹۹۲ء میں روزنامہ "خبریں" سے اپنی کالم نگاری کا آغاز کیا، پھر بعد میں کچھ عرصہ روزنامہ "جنگ" اور پھر جون ۲۰۰۵ء سے تاحال وہ روزنامہ "ایکسپریس" میں "زیرو پوائنٹ" کے عنوان سے اپنا کالم باقاعدگی سے لکھ رہے ہیں، اُن کا یہ کالم عوام میں پسندیدگی کے لحاظ سے سرِّ فہرست ہے۔ عصرِ حاضر کے ایک اور نمایاں کالم نگار ہارون رشید بھی ہیں، جو "ناتمام" کے مستقل عنوان سے معروف اردو اخبارات مثلاً روزنامہ "جنگ" اور روزنامہ "نوائے وقت" وغیرہ میں ایک عرصے سے اور گزشتہ کچھ سالوں سے روزنامہ "۹۲ نیوز" میں اپنے کالم باقاعدگی سے لکھ رہے ہیں۔ اسی طرح عصرِ حاضر کے مقبول ترین کالم نگاروں میں ایک اور اہم نام مشہور ناول نگار، ادیب، سفر نامہ نگار، ٹی وی میزبان اور ڈرامہ نگار مستنصر

حسین تارڑ کا ہے، انھوں نے اسّی کی دہائی سے روزنامہ "مشرق" سے اپنی کالم نگاری شروع کی اور آج کل وہ روزنامہ "۹۲ نیوز" میں اپنے کالم "کاروان سرائے" کے عنوان سے باقاعدگی سے لکھ رہے ہیں۔ اسی طرح کالم نگاری کے میدان میں چند اور نام بھی قابلِ ذکر ہیں، جنھوں نے گزشتہ چند دہائیوں سے اِس شعبے میں مسلسل اپنی خدمات جاری رکھیں اور کالم نگاری کو موجودہ ترقی یافتہ شکل تک پہنچانے میں اپنا خاطر خواہ حصہ ڈالا۔ اِن میں اردو کے معروف شاعر اور کالم نگار منیر نیازی، ظہیر کاشمیری، عبد القادر حسن، ڈاکٹر اجمل نیازی، رؤف کلاسرا، نذیر ناجی، اوریا مقبول جان، زاہدہ حنا، کشور ناہید، سعدیہ قریشی، قدسیہ ممتاز، حامد میر، سلیم صافی، سعود عثمانی، ناصر محمود ملک، کنور دلشاد، ڈاکٹر محمد یونس بٹ، ظفر اقبال، خورشید ندیم، سلمان عابد، ظہیر اختر بیدری، ڈاکٹر رشید احمد خان، راؤ خالد، مجاہد بریلوی، ڈاکٹر طاہر مسعود، ارشاد بھٹی، حسن مجتبیٰ، ڈاکٹر صغرا صدف، پروفیسر سید اسرار بخاری، حسن نثار اور محمد اظہار الحق جیسے نمایاں نام زیادہ قابلِ ذکر ہیں، جو عصرِ حاضر میں اپنی کالم نگاری سے اپنے قارئین کے ذوق کو اور اردو ادب کے دامن کو بخوبی سیر اب کر رہے ہیں۔

اردو کالم نگاری کی اِس روایت اور ارتقاء کے جائزہ سے پتہ چلتا ہے کہ اِس میں ماضی کی طرح عصرِ حاضر میں بھی کئی ایسے نمایاں اور قابلِ قدر ادیبوں، شاعروں اور کالم نگاروں کے نام ہیں، جنھوں نے بالخصوص اردو کالم نگاری کی ترقی اور فروغ میں گرانقدر حصہ ڈالا ہے، بلکہ بدستور ڈال رہے ہیں اور اُن کی شراکت اور کاوشوں کی بدولت ہم موجودہ عہد میں کالم نگاری کی اِس انتہائی بہتر اور جدید منزل تک پہنچنے میں کامیاب ہو سکے ہیں۔

ز)۔ محمد اظہار الحق تعارف اور ادبی زندگی کا آغاز:

محمد اظہار الحق پاکستان کی مشہور و معروف ادبی شخصیت ہیں۔ اُن کا شمار دورِ حاضر کے اہم کالم نگاروں میں ہوتا ہے۔ آپ ۱۴ فروری ۱۹۴۸ء کو ضلع اٹک کی تحصیل فتح جنگ کے گاؤں جھنڈیال کے ایک مذہبی و علمی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ آپ ملک پاکستان کے نامور شاعر، کالم نگار اور محقق ہیں۔ آپ نے ابتدائی تعلیم اپنے دادا حافظ غلام محمد اور اپنے والد حافظ محمد ظہور الحق ظہور سے حاصل کی۔ آپ کے دادا اور والد اپنے اپنے عہد کے جید عالم، دانشور اور ادیب تھے، اُنھوں نے فارسی اور اردو میں شاعری اور نثر میں کئی کتابیں لکھیں۔ محمد اظہار الحق نے گورنمنٹ اصغر مال کالج راولپنڈی سے پہلی پوزیشن کے ساتھ گریجویشن کیا اور پھر ڈھاکہ یونیورسٹی

سے بین الصوبائی (انٹر ونگ) سکالر شپ پروگرام کے تحت معاشیات میں ایم اے کی ڈگری نمایاں نمبروں سے حاصل کی۔ پنجاب یونیورسٹی سے پرائیوٹ ایم اے عربی درجۂ اول میں پاس کرنے کے ساتھ ساتھ اسلام آباد سے ازبک زبان سیکھی اور فارسی میں بھی مہارت حاصل کی۔ ۱۹۷۲ء میں سی ایس ایس کا امتحان پاس کر کے پاکستان سول سروس کو اختیار کیا اور کئی اعلیٰ عہدوں پر کام کرنے کے بعد ۲۰۰۸ء میں ریٹائر ہو گئے۔

۱۹۷۵ء میں محمد اظہار الحق زاہدہ شاہین کے ساتھ رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوئے۔ آج کل وہ اسلام آباد میں ڈیفنس ہاؤسنگ سوسائٹی میں رہائش پذیر ہیں۔ مگر اپنے بچوں سے ملنے اکثر آسٹریلیا کے شہر میلبورن جا کے کئی کئی دن تک وہاں قیام کرتے ہیں، اور وہاں کے اخبارات میں کالم بھی لکھتے رہتے ہیں، گویا کہ میلبورن اُن کے لئے دوسرا گھر ہے۔ محمد اظہار الحق کے تین بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں، اور وُہ ریٹائرمنٹ کے بعد اپنی رفیقۂ حیات زاہدہ اظہار کے ساتھ بہت خوش گوار زندگی بسر کر رہے ہیں اور ۷۱ سال کی عمر میں بھی قابلِ رشک صحت رکھتے ہیں۔

جمعرات ۲۹ نومبر ۲۰۱۸ء کا دن میری تحقیق میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔ میں نے محمد اظہار الحق صاحب سے تحقیق کے سلسلے میں کچھ سوالات کیے تو انھوں نے کمال مہربانی کرتے ہوئے مجھے مذکورہ دن، ۱۱ بجے، اسلام آباد میں، ڈیفنس ہاؤسنگ سوسائٹی میں واقع اپنے نو تعمیر شدہ گھر میں ملاقات کے لیے بلا لیا۔ میں مقررہ وقت پر اُن کے پاس موجود تھا۔ چار گھنٹوں سے زیادہ جاری رہنے والی اِس یادگار ملاقات میں محمد اظہار الحق صاحب نے اپنی زندگی اور اپنی کالم نگاری کے بارے میں تفصیلی معلومات فراہم کیں۔

بیگم اظہار الحق، محترمہ زاہدہ شاہین صاحبہ نے بھی میرے پوچھے گئے سوالات کے شفقت بھرے انداز میں جوابات دیے۔ بچوں کے بارے میں تفصیل فراہم کرتے ہوئے انھوں نے بتایا کہ سب سے بڑے بیٹے محمد اسرار الحق ہیں جنھوں نے "دل" کے شعبے میں ڈاکٹریٹ کی اعلیٰ ڈگری حاصل کی ہے، وہ اِس وقت (میلبورن) آسٹریلیا کے ایک ہسپتال میں ماہرِ امراضِ قلب کی حیثیت سے اپنی خدمات سرانجام دے رہے ہیں، انھیں کوہ پیمائی اور فکشن سے کافی شغف ہے اور کوہ پیمائی کے حوالے سے اُن کے کئی آرٹیکل اور افسانے "ڈان" اخبار میں چھپ چکے ہیں۔ دوسرے نمبر پر اُن کی بڑی بیٹی مہوش بتول ہیں جو اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ لاہور میں رہائش پذیر ہیں۔ محمد اظہار الحق اپنی اِس بیٹی اور نواسوں سے ملنے اکثر لاہور جاتے رہتے ہیں۔ بچوں میں تیسرے نمبر پر اُن کے منجھلے بیٹے حسان بن اظہار ہیں جو انکم ٹیکس کے شعبے میں ڈپٹی کمشنر کے طور پر اپنے فرائضِ منصبی سرانجام دے رہے ہیں۔ یہ اعلیٰ شعری ذوق رکھتے ہیں۔

بچوں میں چوتھے نمبر پر معاذ بن اظہار ہیں۔ جو پہلے کامسٹ یونیورسٹی میں لیکچرار تھے اور اب بیرونِ ملک تدریسی فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔ بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹی مرضیہ شاہین ملک ہیں جو پیدائشی آرٹسٹ ہیں۔ انھوں نے اپنے بچپن میں بچوں کے لیے نظموں کی ایک کتاب لکھی تھی، جس کا عنوان "بکری والا بابا" ہے، اِس کے علاوہ وہ پینٹنگ میں بھی مہارت اور دلچسپی رکھتی ہیں اور آج کل "ڈان" اخبار میں ملازمت کر رہی ہیں۔ بیگم اظہار الحق کا کہنا ہے کہ پہلے ملازمت اور اب بے تحاشہ صحافتی ذمہ داریوں کے باوجود اظہارالحق صاحب ہمیشہ گھر کے معاملات میں اُن کی معاونت کرتے ہیں۔ بچوں سے بہت پیار کرتے ہیں اور اُن کو بھرپور وقت دیتے ہیں اور جو ٹائم بچوں اور فیملی کے لیے مختص کر دیں، پھر اُس میں کسی اور مصروفیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اُن کی پہلی اور آخری ترجیح اُن کے بچے اور اُن کا گھر ہے۔ بچوں میں انھیں اپنی نواسی "زینب" سے خصوصی لگاؤ ہے جو اُن کی اولاد کی سب سے پہلی بچی ہے۔

محمد اظہار الحق نے ایک سوال کے جواب میں کہا کہ انھیں بہت خوشی ہے کہ اُن کا اپنے گاؤں سے ناطہ ابھی تک برقرار ہے اور بلاشبہ اِس بات کا سہرا اُن کی رفیقۂ حیات کو جاتا ہے کہ وہ گاؤں سے رشتہ اُستوار رکھنے میں اُن سے زیادہ سرگرمِ عمل ہیں۔ گاؤں کی جو زمینیں مزارعوں کے زیرِ استعمال ہیں، اُن کا حساب کتاب بھی بیگم دیکھتی ہیں اور انھوں نے اپنے میاں کو مکمل آزادی دے رکھی ہے تاکہ وہ کامل یکسوئی سے اپنی صحافتی اور ادبی ذمہ داریاں بخوبی پوری کر سکیں۔

شاعری میں محمد اظہار الحق کی چار کتابیں "دیوارِ آب" (۱۹۸۲ء آدم جی ایوارڈ یافتہ)، "غدر" (۱۹۸۶ء)، "پری زاد" (۱۹۹۵ء) اور "پانی پہ بچھا تخت" (۲۰۰۳ء) (علامہ اقبال ایوارڈ یافتہ) شائع ہو چکی ہیں۔ ان تمام کتب کا مجموعہ ۲۰۱۲ء میں "کئی موسم گذر گئے مجھ پر" کے نام سے منظرِ عام پر آیا۔ محمد اظہار الحق کی شاعری کو یاسمین حمید نے انگریزی میں ترجمہ کر کے "پاکستانی اردو شاعری" کے نام سے ۲۰۱۰ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی پریس سے کتابی شکل میں شائع کرایا۔

محمد اظہار الحق پاکستان کے چوٹی کے اخبارات مثلاً "روزنامہ جنگ"، "نوائے وقت"، "جناح" اور موجودہ وقت میں "دنیا" اور "۹۲ نیوز" میں باقاعدگی سے "تلخ نوائی" کے عنوان سے کالم لکھتے ہیں۔ اُن کے کالم سیاست، معاشرت، ترقی پسندی، اخلاقیات اور مذہب کے گرد گھومتے ہیں۔ آپ کے کالموں میں جہاں دلکش انفرادیت ہے وہیں اردو اور فارسی میں خاص مہارت کی وجہ سے آپ کے کالموں میں ان دونوں زبانوں کی ادبی چاشنی جھلکتی ہے۔ آپ کے کالم عام فہم ہونے کی بنا پر عوامی سطح پر پسندیدگی اور دلچسپی سے پڑھے جاتے ہیں۔ اگرچہ

اردو میں محمد اظہار الحق کی کالم نویسی مستقل حیثیت کی حامل ہے مگر ساتھ ساتھ وہ انگریزی میں بھی کالم لکھتے ہیں جو ملکی سطح پر "دی نیوز" (The News) اور بین الاقوامی سطح پر بنگلہ دیش میں "دی بنگلہ دیش ٹوڈے" (The Bangladesh Today) اور آسٹریلیا میں "دی ایج" (The Age) اخبار میں چھپتے رہتے ہیں۔

محمد اظہار الحق نے ادارہ قومی زبان کی معاونت کرتے ہوئے قومی اردو انگلش لغت کی تیاری میں بھی اپنا نمایاں حصہ ڈالا۔ اِس کے علاوہ اُنھوں نے اکادمی ادبیات پاکستان کے ساتھ معاونت کرتے ہوئے پاکستانی ادب کے سالانہ چناؤ میں تدوین و تالیف میں قابلِ قدر خدمات سرانجام دیں۔ اردو ادب میں اعلیٰ خدمات کے اعتراف میں حکومتِ پاکستان نے محمد اظہار الحق کو ۲۰۰۸ء میں پرائیڈ آف پرفارمنس سے نوازا۔ اِسی طرح کیپیٹل ڈیولپمنٹ اتھارٹی اسلام آباد نے محمد اظہار الحق کے اعزاز میں ۲۰۱۷ء میں اپنی لائبریری کا ایک گوشہ "گوشہءِ اظہار" کے نام سے منسوب کر دیا۔

س)۔ محمد اظہار الحق کی اردو کالم نگاری:

محمد اظہار الحق ابتدا میں ۱۹۹۰ء کی دہائی میں روزنامہ "جنگ" میں کالم لکھتے تھے۔ اردو زبان پر عبور رکھنے کی وجہ سے ان کے کالم شروع ہی سے تعلیم یافتہ طبقے میں بہت مقبول تھے اور عوامی سطح پر پسند کیے جاتے تھے۔ محمد اظہار الحق کی اردو کالم نگاری کی خصوصیات میں سلاست، اختصار، مقصدیت، معنویت، رجائیت اور جامعیت ہیں۔ محمد اظہار الحق کی اردو کالم نگاری میں کوئی ایک فقرہ بھی ایسا نہیں ہوتا ہے جسے غیر ضروری یا فالتو کہہ کر نکالا جا سکے، آسان اور عام فہم زبان میں، عوامی دلچسپی اور روزمرّہ زندگی سے متعلقہ موضوعات پر، مختصر اور جامع انداز میں لکھے جانے والے ان کے کالم عوامی سطح پر پسند کیے جاتے ہیں۔

محمد اظہار الحق نے اُس دور میں کالم نگاری شروع کی جب ہارون الرشید، مجیب الرحمٰن شامی اور اظہر سہیل جیسے معیاری اردو کالم لکھنے والے موجود تھے لیکن ان کی موجودگی کے باوجود محمد اظہار الحق نے اردو کالم نگاری میں اپنی پہچان بنائی۔ محمد اظہار الحق چونکہ سرکار کی نوکری سے منسلک تھے، اور بائیسویں گریڈ کے ذمہ دار افسر تھے اِس لیے منصبی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے وہ صحافتی سرگرمیوں کو خاطر خواہ وقت نہ دے سکے اور کچھ وقت کے لیے صحافتی منظر نامے سے ہٹ گئے۔ مگر ایک اچھا لکھنے والا کب تک خود کو لکھنے سے دور رکھ سکتا ہے۔ ۲۰۰۸ء میں اپنی ملازمت سے ریٹائر ہونے کے فوراً بعد محمد اظہار الحق نے دوبارہ کالم نگاری شروع کی۔ اُن دنوں اخبار "دنیا" نیا نیا شروع ہوا تھا۔ محمد اظہار الحق نے اِسی اخبار سے اپنی کالم نگاری کا از سرِ نو

آغاز کیا۔ محمد اظہار الحق ہمیشہ کھری اور سچی بات کہنے والا لکھاری ہے۔ مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی شک نہیں ہے کہ اب تک جتنے سرکاری افسران بھی ریٹائرمنٹ کے بعد لکھتے رہے ہیں یا موجودہ وقت میں لکھ رہے ہیں اگر اُن میں سے دو چار نے اپنے قلم اور اپنے ضمیر کے ساتھ انصاف کیا ہے تو محمد اظہار الحق اُن میں سرِّ فہرست ہیں۔ اپنے قلم سے تلوار کی طرح صرف وہی ریٹائرڈ سرکاری افسر ہی لکھ سکتا ہے جس نے ساری عمر ایک صاف ستھری ملازمت کی ہو، جس کے ضمیر پر کوئی بوجھ نہ ہو، جس نے اپنے رب اور اپنے من کو خوش کرنے کے لیے نوکری کی ہو نہ کہ حکمرانوں کا مہرہ اور خوشامدی بن کے کام کیا ہو۔ محمد اظہار الحق نے جس طرح اپنی بیوروکریٹ کلاس کا پوسٹ مارٹم کیا ہے وُہ شاید ہی کوئی دوسرا کر سکے۔

محمد اظہار الحق کا اپنی جڑوں سے مضبوط رشتہ ہے۔ جتنے خوبصورت کالم محمد اظہار الحق نے اپنے گاؤں کی زندگی، روایات اور گاؤں کے بزرگوں پر لکھے ہیں، وُہ اپنی جگہ ایک الگ جہان ہے، ایک نئی دنیا ہے۔ اُن کے وُہ کالم پڑھ کر یوں لگتا ہے کہ جیسے انھوں نے اپنا ماضی ہمارے سامنے لا کھڑا کیا ہو۔ محمد اظہار الحق کی تحریر کی یہ خوبی ہے کہ قاری خود کو اُس کے سحر سے نہیں بچا سکتا۔ قاری کو لگتا ہے کہ یہ محمد اظہار الحق کا گاؤں نہیں ہے، اُن کا بچپن نہیں ہے، یہ اُن کے گاؤں کی گلیاں اور پگڈنڈیاں نہیں ہیں ہیں، وُہ پرانے لوگ، حویلیاں، گرمیوں کی دوپہر، کسی دور تنہا درخت پر بیٹھی فاختہ کا دکھ بھرا گیت، مٹی کے بنے انسان کی زندگی کی طرح غیر ہموار اور کمزور گھروندوں کی داستانیں۔۔۔ ہم سب کی اپنی کہانیاں ہیں۔ ہمارا ترکہ ہے اور ہم سب کا مشترکہ ماضی ہے۔

محمد اظہار الحق کی کالم نگاری سے امید اور حوصلہ مندی کا درس ملتا ہے، انھوں نے اپنے قارئین کو مثبت سوچ فراہم کی ہے، وُہ ملکی معاشی حالات کی بہتری کے لیے کوشاں لگتے ہیں۔ معاشی میدان میں ہر پہلو پر محمد اظہار الحق کی گہری نظر ہوتی ہے اور وُہ دل سے خواہش رکھتے ہیں کہ عام آدمی بھی بہتر زندگی سے مستفید ہو اور اُسے تمام لازمی ضروریاتِ زندگی کی آسان اور یقینی فراہمی حاصل ہو۔ محمد اظہار الحق جب آسٹریلیا میں مقیم اپنے چھوٹے پوتوں حمزہ اور تیمور کو یاد کرتے ہیں تو وُہ صرف خود پوٹھواری گیت گا کر نہیں روتے بلکہ ساتھ اپنے قاری کو بھی رلاتے ہیں۔ اپنی دھرتی ماں، اپنی مٹی، ماں بولی، بھولی بسری روایتوں اور فوک کہانیوں سے جتنا وہ پیار کرتے ہیں، وہ آپ کو ایک اور دنیا میں لے جاتا ہے اور آپ پھر اُسی دنیا میں خود کو گم کرنے کے خواہش مند ہو جاتے ہیں۔ محمد اظہار الحق نے ادب پڑھ رکھا ہے، چاہے وہ اردو کلاسک ہو، انگلش ہو یا پھر فارسی اور اِس سب کا استعمال کرنا وہ بخوبی جانتے ہیں اور اِسی چیز نے اُن کے کالموں کا حسن اور اثر پذیری بڑھا دی ہے۔ ادب سے محبت نے انھیں اِس قابل کر دیا ہے کہ وُہ نئے نئے موضوعات پر لکھ سکیں تاکہ قاری کبھی

یکسانیت اور بوریت کا شکار نہ ہو۔ محمد اظہار الحق بلاشبہ ایک منفرد اور عہد ساز کالم نگار ہیں، اُن کی اکثر تحریریں اپنے اندر ایسی دلکشی اور انفرادیت کا ایک جہان لیے ہوئے ہوتی ہیں، جو اپنے قاری کو اپنے سحر میں جکڑ لیتی ہیں۔

اسلام اور اسلامی دنیا کے عروج وزوال پر بعض تحریریں ایسی بے مثال ہیں کہ جنھیں ہمارے نصاب کا حصہ ہونا چاہیے۔ محمد اظہار الحق نے جس طرح اپنے شاندار ماضی میں زندہ رہنے والے مسلمانوں کو آئینہ دکھانے کی کوشش کی ہے وُہ کوئی آسان کام نہیں تھا، وُہ بھی ایک ایسے معاشرے میں جہاں عدم برداشت حد سے زیادہ ہے، اِسی طرح طالبان کے خلاف اُن کے لکھے گئے کالم بھی اپنی جگہ بڑی خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ محمد اظہار الحق کے قلم نے کسی کے ساتھ رعایت نہیں برتی۔ کسی خطاکار کو بھی نہیں بخشا۔ محمد اظہار الحق اپنے کالموں میں مسلمانوں میں نمود و نمائش اور دکھلاوے پر بھی بہت زیادہ تنقید کرتے ہیں، جو آج کل ہمارے معاشرے بہت زیادہ نظر آرہے ہیں، وُہ اِس بات پر بہت کڑھتے نظر آتے ہیں کہ مسلمانوں نے اپنے دین کو بھی خالص نہیں چھوڑا ہے بلکہ اِس میں بھی تصنع اور بناوٹ کو شامل کر لیا ہے۔ آج کے مسلمان کا مقصدِ حیات دائمی اور اُخروی کامیابی کے بجائے محض دنیاوی دھن دولت کا حصول ہی رہ گیا ہے، اور دولتِ دنیا کے حصول میں آج کا مسلمان اخلاقی اور مذہبی قدر کو کھو چکا ہے، وہ حد درجہ اخلاقی پستی میں گر چکا ہے اور انسانیت کے اعلیٰ وارفع مقام سے گر کر ذلتوں کی اتھاہ گہرائیوں میں پہنچ چکا ہے۔ جو چیز محمد اظہار الحق کو اردو کالم نگاروں میں ممتاز کرتی ہے، وُہ یہ ہے کہ اُن کے اندر یورپی ملکوں کے خلاف وُہ روایتی تعصّبات نہیں ہیں جو ہمارے اکثر کالم نگاروں اور لکھاریوں میں نظر آتے ہیں، وُہ اگر بیرونِ ملک گئے تو اُن ملکوں کی اچھی چیزوں اور روایات کا پرچار کیا اور اُنھوں نے مغربی معاشروں کو نصیحتیں کرنے یا مشرقی روایات کی عظمت کے گیت گانے کے بجائے الٹا ہمیں یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ ہم اُن غیر مسلموں سے کون کون سی اچھی باتیں سیکھ کے اپنا سکتے ہیں۔ الغرض محمد اظہار الحق کی تحریروں میں ہمیں نئے خیالات ملتے ہیں، سوچ اور فکر کی ایک نئی دنیا ملتی ہے، جہاں ماضی، حال اور مستقبل باہم گلے ملتے محسوس ہوتے ہیں۔ اُن کے قلم میں تیز کاٹ ہے، درد ہے، انسان دوستی ہے،

گاؤں کی برستی بارش میں کچی مٹی کی بھینی بھینی خوشبو ہے، صدیوں پرانی روایات کا اِحیاء ہے اور سب سے بڑھ کر اپنے سے طاقتور کے خلاف، ظالم حکمران کے سامنے بولنے کی جرات ہے۔۔۔

محمد اظہار الحق کے بارے میں عصرِ حاضر کے ممتاز کالم نگار اور ادیب رؤف کلاسرا کہتے ہیں:

"محمد اظہار الحق کے قلم نے کسی کا خیال رکھا تو صرف اور صرف اپنے ضمیر، اپنے قاری اور اپنی دھرتی کے مفادات کا۔ اُن کی تحریریں آنے والے زمانوں میں بھی پڑھی جائیں گی اور میرے جیسی نسٹلیجیا کا شکار، صدیوں کے سفر کا بوجھ اٹھائے، بوڑھی روحیں، اُس وقت بھی اُن کے بعض کالموں پر اپنی آنکھیں بھیگی کیے بغیر نہیں رہ سکیں گی"۔[۲۸]

محمد اظہار الحق نے اگرچہ کم کم لکھا ہے، مگر جو بھی لکھا ہے، باکمال اور لاجواب لکھا ہے۔ اُنھوں نے سچ کے سوا کچھ نہ لکھا ہے۔ محمد اظہار الحق خواص میں رہنے کے باوجود عوام میں سے ہیں، اپنی دھرتی اور عوام سے اُن کا رابطہ کبھی بھی کم نہیں ہوا ہے اور انھوں نے جو کچھ بھی لکھا ہے، وُہ عوام کے لئے ہی لکھا ہے اور عوام نے بھی اُن کے کام کی بھرپور پذیرائی کی ہے۔ محمد اظہار الحق کی کالم نگاری کی بڑی خوبی کردار سازی ہے۔ محمد اظہار الحق بخوبی جانتے ہیں کہ معاشرتی اور اجتماعی تعمیرِ نو میں افراد کی اخلاقی بالیدگی اور بلند کرداری کو بنیادی اہمیت حاصل ہے چنانچہ اسلام کی اعلیٰ اخلاقی اور روحانی اقدار کے انسانی سیرت و کردار میں ڈھلنے کی آرزو اُن کی کالم نگاری میں بار بار سامنے آتی رہتی ہے۔ محمد اظہار الحق کی کالم نگاری کی انفرادیت یہ ہے کہ انھوں نے کالم نگاری کے میدان میں اپنی الگ پہچان بنائی ہے اور الگ دنیا بسائی ہے، یہ دنیا اپنی سادگی، تازگی، مناظر، رنگوں، فضاؤں، ہواؤں، اپنے وقوعوں اور اپنی خوشبوؤں ہر لحاظ سے دوسروں سے منفرد ہے۔ محمد اظہار الحق نے اپنے من کی دنیا میں ڈوب کر کالم نگاری کی ہے، اِس لیے اُن کے ہر لفظ اور ہر سطر میں تاثیر ہے۔ محمد اظہار الحق اپنے خیالات، کام، فکر، سوچ اور تحریروں کی وجہ سے اپنے قارئین کے دلوں پر ہمیشہ راج کرتے رہیں گے۔

حوالہ جات

۱۔Oxford Advanced Learner`s Dictionary of current English by A.S Hornby, Oxford University Press Great Claredon Street, oxford OX2 6DP Eight Edition 2010. Page 292

۲۔ جمیل جالبی (مرتب)، فرہنگ اصطلاحات جامعہ عثمانیہ، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، مطبع اظہار سنز پرنٹرز رنگٹن روڈ لاہور، ص ۸۷

۳۔Qomi English Urdu Dictionary Edited by Dr. Jameel Jalbi.

Page 401

۴۔ نورالحسن نیّر، مولانا، نورالغات (جلد دوم)، نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد، نیلاب پرنٹرز گوالمنڈی، راولپنڈی، ص ۹۱۷

۵۔The Encyclopaedia Britannica Volume III, 1973. Page 292

۶۔www.thefreedictionary.com, 12 Aug.2018,8:00 a.m

۷۔http://www.etymonline.com, 19 Dec.2018,11:00 a.m

۸۔hppt://dictionary.reference.com/browser/column,24 Aug.2018,9:00 p.m

۹۔ عبدالغفار کوکب، فکاہیہ کالم نگاری، آغاز تا حال، اخبارِ جنگ، ۳جولائی ۲۰۰۶ء، ص ۷

۱۰۔ مولانا امداد صابری، روحِ صحافت، مکتبہءِ شاہراہ اردو بازار، دہلی۔۶، ۱۹۶۸ء، ص ۲۳

۱۱۔ مسکین علی حجازی، ڈاکٹر، پنجاب میں اردو صحافت کی تاریخ، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۹۷ء، ص ۵۲

۱۲۔ عبدالسلام خورشید، ڈاکٹر، اردو صحافت پاک و ہند میں، انجمن ترقی اردو، کراچی، ۱۹۶۶ء، ص ۴۱

۱۳۔ عبدالسلام خورشید، ڈاکٹر، اردو صحافت پاک و ہند میں، ایضاً، ص ۴۲

۱۴۔ محمد اسلم ڈوگر، فیچر، کالم، تبصرہ، مقتدرہ قومی زبان پطرس بخاری روڈ ایچ ایٹ فور اسلام آباد، ۱۹۹۸ء، ص ۸۷

۱۵۔ شفیق جالندھری، ڈاکٹر، اردو کالم نویسی، اے ون پبلشرز، الفضل مارکیٹ، اردو بازار لاہور، ۱۹۹۳ء، ص ۸۳

۱۶۔ محمد عتیق صدیقی، ہندوستانی اخبار نویسی (کمپنی کے عہد میں) پبلی کیشنز فرید چیمبر عبداللہ ہارون روڈ، کراچی پاکستان، ۱۹۸۰ء، ص ۲۷۴۔۲۷۳

۱۷۔ مسکین علی حجازی، ڈاکٹر، پنجاب میں اردو صحافت کی تاریخ، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۹۷ء، ص ۸۱

۱۸۔ محمد عتیق صدیقی، ہندوستانی اخبار نویسی (کمپنی کے عہد میں) پبلی کیشنز فرید چیمبر عبداللہ ہارون روڈ، کراچی پاکستان، ۱۹۸۰ء، ص ۳۰۴

۱۹۔ عبد السلام خورشید، ڈاکٹر، اردو صحافت پاک و ہند میں، انجمن ترقی اردو، کراچی، ۱۹۶۶ء، ص ۲۳۴
۲۰۔ ظفر عالم ظفری، اردو صحافت میں طنز و مزاح، فیروز سنز، لاہور، ۱۹۹۶ء، ص ۵۲۔ ۵۱
۲۱۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، اردو ادب میں طنز و مزاح، مکتبہ عالیہ، اردو بازار، لاہور، ۱۹۹۳ء، ص ۳۲۰۔ ۳۱۹
۲۲۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، اردو ادب میں طنز و مزاح، ایضاً، ص ۳۲۵۔ ۳۲۴
۲۳۔ عبد السلام خورشید، ڈاکٹر، اردو صحافت پاک و ہند میں، انجمن ترقی اردو، کراچی، ۱۹۶۶ء، ص ۲۱۴
۲۴۔ عبد السلام خورشید، ڈاکٹر، اردو صحافت پاک و ہند میں، ایضاً، ص ۳۰۶
۲۵۔ مشتاق صدف، اردو صحافت، زبان، تکنیک، تناظر، سنگ میل روڈ، ایچ ایٹ فور، اسلام آباد، ص ۱۵۱
۲۶۔ شفیق جالندھری، ڈاکٹر، اردو کالم نویسی، اے ون پبلشرز، الفضل مارکیٹ، اردو بازار لاہور، ۱۹۹۳ء، ص ۱۰۶
۲۷۔ شفیق جالندھری، ڈاکٹر، اردو کالم نویسی، ایضاً، ص ۱۱۹
۲۸۔ رؤف کلاسرا، پیش لفظ تلخ نوائی، محمد اظہار الحق، المیزان پبلشرز، الکریم مارکیٹ، اردو بازار لاہور، ۲۰۱۶ء، ص ۱۰

باب دوم

محمد اظہار الحق کی کالم نگاری کی ادبی ،سیاسی، تاریخی اور مذہبی جہات کا تنقیدی مطالعہ

الف)۔ محمد اظہار الحق کے کالموں میں زبان وادب کا ذکر:

زبان

زبان جسے عربی میں لسان اور انگریزی میں (Language) کہتے ہیں رابطے کا ذریعہ ہے اور اِسے معلومات کے تبادلہ کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ معلومات کا یہ تبادلہ تحریری طور پر، اشاروں کی مدد سے، بصری مواد یا اشتہارات کے استعمال سے، علامتوں کے استعمال سے یا براہِ راست کلام سے ممکن ہوتا ہے انسانوں کے علاوہ دیگر مختلف جاندار بھی آپس میں معلومات کا تبادلہ کرتے رہتے ہیں مگر زبان سے مراد عام طور پر وُہ نظام لیا جاتا ہے، جِس کے ذریعے انسان ایک دوسرے سے تبادلہء خیالات اور تبادلہء معلومات کرتے ہیں۔ دنیا میں اس وقت بھی ہزاروں مختلف زبانیں اپنا وجود رکھتی ہیں جن میں سے کئی زبانیں بڑی تیزی سے ناپید ہو رہی ہیں۔ مختلف زبانوں کی تخلیق، ترقی اور ارتقاء کا تجزیہ لسانیات کی مدد سے کیا جاتا ہے۔ زبانیں عام طور پر کسی معاشرے کی ضرورت اور ماحول کے اعتبار سے ظہور پاتی ہیں اور استعمال کے لحاظ سے اپنا وجود برقرار رکھتی ہیں۔ جو زبانیں انسانی رابطے کے لیے استعمال ہوتی ہیں وُہ قدرتی زبانیں ہیں اور کمپیوٹر میں استعمال ہونے والی زبانیں مصنوعی زبانیں کہلاتی ہیں۔

چیکوسلوواکیہ کی ایک معروف کہاوت ہے کہ ایک نئی زبان سیکھو اور ایک نئی روح حاصل کرو۔

Learn a new language and get a new soul.

یہ ایک حقیقت ہے کہ زبان کا انسان کے ذہنی ارتقاء کے ساتھ بہت ہی گہرا تعلق ہے۔ اگرچہ زیادہ زبانیں جاننا انسانی ارتقاء کے لیے ضروری نہیں ہے لیکن انسانی ارتقاء کا تجربہ وُہی لوگ بہتر طور پر کر سکتے ہیں جو ایک سے زیادہ زبانیں جانتے ہوں۔ معروف مصری ادیب ڈاکٹر احمد امین نے اپنی خود نوشت سوانح عمری میں لکھا ہے کہ

پہلے میں صرف اپنی مادری زبان عربی جانتا تھا اُس کے بعد میں نے انگریزی زبان سیکھنا شروع کی، غیر معمولی محنت کے بعد میں نے یہ استعداد پیدا کر لی کہ میں انگریزی کتب پڑھ کر سمجھ سکوں۔ وُہ لکھتے ہیں کہ جب میں انگریزی سیکھ چکا تو مجھے ایسا محسوس ہوا گویا پہلے میں صرف ایک آنکھ رکھتا تھا اور اب میں دو آنکھوں والا ہو گیا ہوں۔ یہ اللہ کا فضل ہے کہ میں اپنی مادری زبان کے علاوہ دوسری زبانیں سیکھنے کا موقع پا سکا اور اب میں کم و بیش پانچ زبانیں جانتا ہوں۔ اگر میں صرف اپنی مادری زبان ہی جانتا تو یقیناً معرفت کے بہت سارے دروازے مجھ پر بند ہی رہتے۔

ادب

ادب (Literature) عربی زبان کا لفظ ہے اور مختلف معانی رکھتا ہے۔ اسلام کے ظہور سے پہلے عربی زبان میں مہمان نوازی اور ضیافت کے معنوں میں اِس کا استعمال ہوتا تھا۔ بعد میں اِس کا استعمال شائستگی کے معنوں میں بھی کیا جانے لگا۔ اسلام سے قبل خوش بیانی کو اعلیٰ ادب کہا جاتا تھا، نیز نرمی، گداز، گھلاوٹ اور شائستگی جیسی اعلیٰ اقدار بھی اِس کا لازمی جزو تھیں۔ بنو امیہ کے دورِ حکومت میں کوفے اور بصرے میں زبان کے تحریری سرمائے میں قابلِ قدر اضافہ ہوا، اُسی زمانے میں گرائمر اور صرف و نحو کی کئی کتب لکھی گئیں تاکہ ادب میں اندازِ بیان صحت مندانہ انداز میں قائم رہے۔ جدید دور میں ادب کے معنی مخصوص قرار دیے گئے ہیں اور ادب کے لیے ضروری قرار دیا گیا ہے کہ اِس میں تخیل اور جذبات ہوں ورنہ ہر تحریری کارنامہ ادب کہلا سکتا ہے۔ تخلیق کی خواہش انسانی فطرت ہے۔ انسان کی اِسی جبلت کی وجہ سے آرٹ پیدا ہوتا ہے۔ آرٹ اور دوسرے علوم میں یہی فرق ہے کہ اِس میں مقصد کسی مالی فائدے کا حصول نہیں ہے بلکہ بے غرض مسّرت حاصل کرنا ہے۔ میتھیو آرنلڈ ادب کی تعریف کچھ یوں کرتا ہے:

> "ادب آرٹ کی وُہ شاخ ہے جسے "فنِ لطیف" بھی کہتے ہیں۔ میتھیو آرنلڈ کے نزدیک وُہ تمام علم جو کتب کے ذریعے ہم تک پہنچا ہے، ادب کہلاتا ہے"۔ [1]

ادب چونکہ زندگی کو موضوع بناتا ہے اِس لیے کوئی بھی ادیب جب کسی قسم کا ادب تخلیق کرتا ہے تو وہ ادب معاشرے کی سوچ اور اظہار کی نمائندگی کرتا ہے۔ ادب کے بارے میں کارڈینل نیومین کہتا ہے:

"زبان اور الفاظ کے ذریعے انسانی افکار، خیالات اور احساسات کا اظہار ادب کہلاتا ہے"۔ [۲]

ادب ادیب کی زندگی اور عہد کی عکاسی کرتا ہے اور اِس کی تخلیق میں کئی عوامل کارفرما ہوتے ہیں، مثلاً انسانی فکر، درد، ماحول، ذات، معاشرہ، مذہب اور اقدار وغیرہ۔ اسی طرح ایک اور محقق نارمن جودک کا ادب کے حوالے سے کہنا ہے:

"ادب سے مراد خیالات و احساسات کا وُہ تمام سرمایہ ہے، جو تحریر میں آچکا ہے اور جسے اِس طرح سے ترتیب دیا گیا ہے کہ پڑھنے والے کو مسّرت حاصل ہوتی ہے"۔ [۳]

اردو زبان پر مشتمل ادب "اردو ادب" کہلاتا ہے جو نثر اور شاعری پر مشتمل ہے۔ اردو ادب کی نثری اصناف میں ناول، داستان، افسانہ، مکتوب نگاری، انشائیہ اور سفر نامہ شامل ہیں جب کہ شاعری میں نظم، غزل، رباعی، قصیدہ، مرثیہ اور مثنوی شامل ہیں۔ اردو ادب میں نثری ادب بھی اتنا ہی اہم ہے جتنا کہ شعری ادب۔

اردو کے عناصرِ خمسہ میں جن شخصیات کے نام آتے ہیں اُن میں سر سید احمد خان، مولانا الطاف حسین حالی، ڈپٹی نذیر احمد، مولانا شبلی نعمانی اور محمد حسین آزاد شامل ہیں۔ اردو کے یہ پانچ بڑے نام وُہ عظیم ہستیاں ہیں کہ جنھوں نے اردو ادب میں انقلاب برپا کر دیا اور اردو ادب میں نئی نئی اصناف کا اضافہ کیا۔ زبان و بیان میں سادگی اپنائی۔ یہ لوگ ادب برائے زندگی کے فلسفہ کے قائل تھے۔ اِنھوں نے ادب کو حقیقت سے روشناس کروایا اور قدامت پرستی سے ادب کو نجات دلائی۔ اِن کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اِنھوں نے ادب میں عام طبقے کے مسائل کو ابھارا، یہ ایک تحریک تھی جِس نے اردو ادب کو نئی ڈگر پر چلنے کے قابل بنایا اگر یہ لوگ نہ ہوتے تو اردو زبان کی یہ ترقی یافتہ شکل ہمارے سامنے نہ ہوتی۔

ب)۔ ادب اور صحافت کا تعلق:

ادب اور صحافت کا رشتہ بہت مضبوط اور گہرا ہے۔اِس حقیقت سے کبھی بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ صحافت کی جڑوں کی سینچائی ادیبوں نے ہی کی ہے ، اسی طرح بہت سے ادیبوں کے لیے صحافت نے ابتدائی تربیت گاہ کا کردار ادا کیا ہے۔ آج جدید وسائل سے مستفید لوگ میڈیا کے اور خصوصاً اخبارات کے اتنے عادی ہو چکے ہیں کہ انھیں ناشتے کی میز پر اخبار کی طلب ہوتی ہے۔ مشہور انگریز صحافی جوزف آرڈو مینک اپنی کتاب میں لکھتا ہے:

"The newspaper does its best to get to your Breakfast table before you turn on the today show or leave to drive to work".[۴]

ادب اور صحافت میں بہت ساری قدریں مشترک ہیں۔ جس طرح معیاری ثقافت معاشرے کی عکاسی کرتی ہے اسی طرح ادب میں بھی معاشرے کا حقیقی عکس نظر آتا ہے۔ادب اور صحافت دونوں انسانوں کے معاملات اور مسائل کو اجاگر کرتے ہیں۔ معاشرے کی حقیقی، زندہ اور سچی تصویر کا نام صحافت ہے اسی طرح ادب بھی معاشرے کا سچّا ترجمان ہوتا ہے۔ حقیقت بیانی صحافت کی سب سے بڑی خوبی ہے، صحافیانہ تحریر سیدھی سادھی ، سپاٹ اور حقیقت نگاری پر مشتمل ہوتی ہے البتہ کالم نگار اپنی تحریروں میں تخیل سے بھی کام لیتے ہیں اور جذبات سے بھی۔ اُن کے ہاں اچھے سے اچھے الفاظ و تراکیب کا استعمال بھی ملتا ہے اور تشبیہ و استعارہ کا بھی۔ ڈاکٹر ظفر عالم ظفری لکھتے ہیں:

"صحافت اگرچہ ادب نہیں لیکن صحافت میں ادب کا عنصر ضرور موجود ہوتا ہے۔اس کے اداریے، طنزیہ مضامین، فکاہی کالم، سیاسی شاعری، روزانہ چھپنے والی رباعیات و قطعات اپنے اندر ادبی چاشنی رکھتے ہیں۔ اُن میں ایک جیتی جاگتی، ہنستی مسکراتی زندگی کی فنکارانہ عکاسی ہوتی ہے۔اسی کا نام ادب ہے۔۔۔ تاریخِ صحافت اور تاریخِ اردو اِس بات کی گواہ ہے کہ صحافتی ادب نے جس طرح ہماری زندگی کے طلوع و غروب کو، زندگی کی قدروں کو، تاریخی حقائق کو اور سیاسی نشیب و فراز کو قلمبند کیا، وُہ اردو

ادب سے بھی نہ ہو سکا۔اِس سلسلے میں صحافتی ادب کا دائرہ اردو ادب کے دائرہ سے کشادہ ہے۔۔۔ صحافت میں ایسی تحریروں کی بھی کمی نہیں، جنھوں نے اپنے فنکارانہ اظہار کی بنا پر لوگوں میں ایک ہیجانی کیفیت پیدا کی، لوگوں کو انقلاب پر آمادہ کیا اور بہتے دھاروں کا رُخ موڑا۔اُن کی ذہنی و فکری اور سیاسی و سماجی تربیت کی۔ ایسی تحریروں کو ادب کے دائرے سے کسی طور بھی خارج نہیں کیا جاسکتا"۔[۵]

کسی بھی اچھے صحافی کی یہ خوبی ہوتی ہے کہ وہ صحافت کے فن کو مدِ نظر رکھتے ہوئے معیاری تحریر پیش کرے اور ایسی ہی معیاری تحریریں آگے چل کر ادب میں شامل ہو جاتی ہیں۔اور محمد اظہار الحق کی تحریریں بھی بلاشبہ ایسی ہی دِل کو موہ لینے والی ہوتی ہیں۔ جہاں تک ادب اور صحافت کے تعلق کی بات ہے تو شروع سے ہی عیاں ہے کہ صحافی اور ادیب ایک دوسرے سے الگ نہیں ہوتے۔ایک اچھا صحافی اچھا ادیب بھی ہوتا ہے اور ایک اچھا ادیب اچھا صحافی بھی ہو سکتا ہے۔اردو ادب کے فروغ کا یہ سفر جاری رہا۔ آج کے دور میں صحافت کے شعبے سے جڑا ایک نام معروف اردو کالم نگار محمد اظہار الحق کا ہے جو اردو ادب کے فروغ میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔اُن کی کالم نگاری کے موضوعات کیا ہوتے ہیں؟ اِس کا جواب بس یہی ہو سکتا ہے کہ زندگی کی جتنی بھی رنگا رنگی ہے، جتنے بھی زندگی کے شعبے ہیں اور بہترین قوتِ مشاہدہ کے حامل کسی کالم نگار کی تیز نظروں کی زد میں جو کچھ بھی آسکتا ہے، وُہ سب کچھ اُنھوں نے اپنے کالموں کا موضوع بنایا ہے۔اخباری کالم جہاں زبان و ادب کی خدمت کرتا ہے وہاں ہر عہد کی تاریخ کا ریکارڈ بھی ساتھ ساتھ مرتب ہوتا رہتا ہے۔ آج کے ترقی یافتہ دور میں بھی تقریباً سبھی اخبارات میں کالم اور اداریے ہوتے ہیں اور ہر اخبار کی کامیابی اور عوامی پذیرائی کا سبب یہی دونوں چیزیں ہوتی ہیں۔ڈاکٹر مسکین علی حجازی اِس بارے میں لکھتے ہیں:

"دنیا کے ہر خطے میں اخبارات کا آغاز کم و بیش ایک ہی مقصد کے تحت ہوا تھا یعنی تبلیغ و اصلاح۔۔۔ عوام کے لیے جاری کیے جانے والے تمام اخبارات میں ادارتی صفحات اور کالموں کو بنیادی اور اولین اہمیت حاصل ہوتی ہے، کیونکہ قومی رہنماؤں اور مفکروں کے افکار و خیالات مقالات کی صورت میں اِن میں شائع ہوتے رہتے ہیں"۔[۶]

محمد اظہار الحق ضلع اٹک کی تحصیل "فتح جنگ" کے گاؤں "جھنڈیال" سے ہیں اور وُہ اپنے علاقے کے معروف مذہبی و علمی خانوادے سے ہیں، اِس لیے اُن کے اندر سے اُن کا مذہب، گاؤں اور پوٹھوار کی خوبصورت دھرتی کبھی بھی نہیں نکلتے۔ محمد اظہار الحق خوش طبع اور شگفتہ طبیعت کے مالک ہیں، اگرچہ انھوں نے شاعری بھی کی ہے، مگر ادبی کالم نگار کی حیثیت سے انھوں نے زیادہ نام کمایا۔ اپنے کالموں کی شگفتہ تحریروں میں وُہ کاٹ دار جملے لکھتے ہیں اور اپنے ٹارگٹ کو کچھ اِس انداز سے رگیدتے ہیں کہ اُن کا شکار کسی طرح سنبھل نہیں پاتا اور قاری کے لیے فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ وُہ شکار سے ہمدردی کرے یا محمد اظہار الحق کو اُن کی ادبی مہارت پر داد دے، بلاشبہ اظہار صاحب نے اپنی تحریروں اور کالموں سے خود کو منوالیا ہے۔ جتنے خوبصورت کالم محمد اظہار الحق نے اپنے گاؤں کی زندگی، مقامی روایات اور بزرگوں پر لکھے ہیں، وُہ اپنی جگہ ایک الگ جہان ہے، نئی دنیا ہے۔ زندہ اور سدا بہار ادب ہے، اُن کے وُہ کالم پڑھ کر یوں لگتا ہے کہ جیسے انھوں نے اپنا ماضی ہمارے سامنے لا کھڑا کیا ہو۔ محمد اظہار الحق کی تحریر کی یہ لازوال خوبی ہے کہ قاری خود کو اُس کے سحر سے نہیں بچا سکتا۔ قاری کو لگتا ہے کہ یہ محمد اظہار الحق کا گاؤں نہیں ہے، اُن کا بچپن نہیں ہے، یہ اظہار صاحب کے گاؤں کی گلیاں اور پگڈنڈیاں نہیں ہیں، بلکہ یہ سب قاری کا اپنا بچپن ہے، قاری کی اپنی کہانیاں ہیں۔ اپنی دھرتی، غریب عوام اور وطن سے بے تحاشہ محبت کا اظہار محمد اظہار الحق کے کالموں میں جگہ جگہ نظر آتا ہے۔ موجودہ ملکی صورتِ حال کا ذکر کرتے ہوئے محمد اظہار الحق اپنے کالم میں یوں لکھتے ہیں:

> "آج ہم اہلِ پاکستان کو بالعموم اور اہلِ پنجاب کو بالخصوص اُسی صورتِ حال کا سامنا ہے جیسے انگریز دور میں ٹھگوں نے لوگوں کے لئے سفر تقریباً ناممکن بنا دیا تھا۔ آج ٹھگوں کے بجائے ڈاکوؤں نے عوام کی زندگی اجیرن کر رکھی ہے۔ کسی کی کار محفوظ ہے نہ موٹر سائیکل نہ گھر، نہ ساز و سامان، نہ جان، نہ عزت۔ ہر شہری غیر محفوظ ہے۔ ہمیں یہ حقیقت تسلیم کرنا ہو گی کہ حکومت، وفاقی ہے یا صوبائی، ہماری کوئی مدد نہیں کر سکتی۔ اِس کا سبب خدانخواستہ یہ نہیں ہے کہ حکومت نااہل ہے یا غافل ہے۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ حکومت کی مجبوری یہ ہے کہ وُہ مصروف ہے۔ قاتلوں، ڈاکوؤں، کار چوروں، لٹیروں اور اغواکاروں کے خاتمے سے کہیں زیادہ اہم فرائض ہیں، جن کی انجام دہی میں حکمران پھنسے ہوئے ہیں۔ اہم ترین کام یہ ہے کہ حکمرانوں نے

پاکستان کو ترکی بنانا ہے، پیرس بنانا ہے، مدینہ کی ریاست بنانا ہے، بس نہیں بنانا تو عوامی فلاحی ریاست نہیں بنانا"۔[۷]

اظہار صاحب جب آسٹریلیا میں مقیم اپنے چھوٹے پوتوں حمزہ اور تیمور کو یاد کرتے ہیں تو وُہ صرف خود پوٹھواری گیت گا کر نہیں روتے بلکہ ساتھ اپنے قاری کو بھی رلاتے ہیں۔ اپنی دھرتی ماں، اپنی مٹی، ماں بولی، بھولی بسری روایتوں اور فوک کہانیوں سے جتنا وہ پیار کرتے ہیں، اُس سب کا اظہار قاری کو ایک اور دنیا میں لے جاتا ہے اور پھر قاری خود کو اُسی دنیا میں گُم محسوس کرتا ہے۔ محمد اظہار الحق اپنی تحریر میں جب رشتوں کی بات کرتے ہیں تو اُن کا انداز کچھ ہوں ہوتا ہے:

"اِس دنیا میں جتنی بھی معلوم راحتیں ہیں، جیسے شدید پیاس میں ٹھنڈے پانی سے لبریز پیالہ، دھوپ کے سفر میں شیشم کی گھنی چھاؤں، حدِ نظر تک کھلے ہوے پھولوں کا نظارہ، لمبے بحری سفر کے بعد خوب صورت جزیرے کا دکھائی دینا، باغ میں رنگین پرندوں کا اترنا، خواب میں اڑتے ہوئے غالیچے کی سواری، طویل بیماری کے بعد شفا یابی، بیٹی کا وجود اِن تمام راحتوں سے زیادہ شیریں ہے۔ بیٹی خواہ بیٹی ہو یا نواسی یا پوتی، ایک ایسی نعمت ہے جو ایمان کی نعمت کے بعد شاید سب سے زیادہ قیمتی نعمت ہے"۔[۸]

اظہار صاحب نے ادب پڑھ رکھا ہے، چاہے وہ اردو کلاسک ہو، انگلش ہو یا پھر فارسی اور اِس سب کا استعمال بھی وُہ بخوبی جانتے ہیں اور اِسی چیز نے اُن کے کالموں کا حسن اور اثر پذیری بڑھا دی ہے۔ ادب سے محبت نے انھیں اِس قابل کر دیا ہے کہ وُہ نئے نئے موضوعات پر لکھ سکیں تا کہ قاری کبھی یکسانیت اور بوریت کا شکار نہ ہو۔

اپنے ایک کالم "افتخار عارف کہاں ہے" میں محمد اظہار الحق آسٹریلیا کے شہر میلبورن اور اپنے وطنِ عزیز کے دارالخلافہ اور شہرِ اقتدار کا موازنہ کرتے ہوئے موجودہ اسلام آباد کا نقشہ کچھ یوں کھینچتے ہیں:

"حسد کرتا ہوں اور ماتم کرتا ہوں کہ اسلام آباد کی بھی ایسی ہی اٹھان تھی۔ کیا شہر تھا۔ عالم میں انتخاب، نظافت کا مرقع، نظم وضبط کی مثال، ہر طرف ہریالی تھی۔ ایسے ہی دل فریب درخت تھے اور پودے۔ سرما میں سرخ رنگ کے پتے نظروں میں بینائی بھرتے تھے۔ تابستان میں ہر طرف پھول ہی پھول ہوتے تھے۔ ارجنٹینا پارک چھوٹا تھا لیکن سیر کے لیے دیدہ ور، دور دور سے آتے تھے۔ سڑکیں صاف تھیں۔ دھلی، دھلی جیسے روز کارپٹ ہوتی ہوں۔ گھروں کے ارد گرد باغیچے

تھے۔ ترشے ترشائے۔ ہر گھر پودوں اور بوٹوں اور درختوں اور پھولوں اور سبزے کے حصار میں تھا۔ فٹ پاتھ چاندی کی طرح چمکتے تھے۔ کوئی مکین شکایت کرتا تھا تو ترقیاتی ادارے کے سینئر افسر بنفسِ نفیس حاضر ہو جاتے تھے۔ گرین ایریا واقعی گرین ایریا تھا۔ کسی حاکم کی مجال نہ تھی کہ اِس کے کنارے تک کو ہاتھ لگائے۔ رہائشی قطعے، جو نقشہ ساز متعین کر گئے تھے، وہی رہتے تھے اور اُتنے ہی رہتے تھے۔ اقربا پروری تھی نہ دوست نوازی، شکم چھوٹے تھے، پنجوں کی مدد سے نہیں پُر کیے جاتے تھے۔ حرام کھانے والے کم تھے۔ بہت ہی کم اور جو تھے، دوسروں کی نظروں سے چھپتے پھرتے تھے اور اپنی نظروں میں پست تھے! آہ! میری بد بختی اور میری آئندہ نسلوں کی حرماں نصیبی!! آہ! فلک کج رفتار سے میری آسودگی دیکھی نہ گئی۔ آہ! مقدر کا ستارہ برج سعد سے نکلا اور نحوست کے خلا میں گم ہو گیا! ستر کا عشرہ آغاز ہوا اور اِس خوبصورت، شہر بے مثال کا چاند گہن کی زد میں آ گیا اور آج یہ شہر عبرت سرائے ہے۔ ظلمات کی آماجگاہ ہے۔ غلاظت اور گندگی کا ڈھیر ہے۔ مکین پریشان ہیں اور مکان غیر محفوظ، پانی ناپید ہے۔ نظافت عنقا ہے۔ جتنے ناکے ہیں اُس سے زیادہ ڈاکے ہیں۔ چوروں اور لٹیروں میں ہر سیکٹر خود کفیل ہے"۔[۹]

محمد اظہار الحق کی اسلام اور اسلامی دنیا کے عروج و زوال پر بعض تحریریں ایسی بے مثال ہیں کہ جنھیں ہمارے نصاب کا حصہ ہونا چاہیے۔ اُن کی تحریروں میں ہمیں نئے خیالات، سوچ اور فکر کی ایک نئی دنیا ملتی ہے، جہاں ماضی، حال اور مستقبل باہم گلے ملتے محسوس ہوتے ہیں۔ اُن کے قلم میں تیز کاٹ ہے، درد ہے، انسان دوستی ہے، گاؤں کی برستی بارش میں کچی مٹی کی بھینی بھینی خوشبو ہے، صدیوں پرانی روایات کا اِحیاء ہے اور سب سے بڑھ کر اپنے سے طاقتور کے خلاف اور ظالم حکمران کے سامنے کلمۂ حق بولنے کی جرات ہے۔ اپنے کالم "افتخار عارف کہاں ہے" میں شہرِ اقتدار، اسلام آباد کے امن وامان کا تذکرہ وُہ کچھ یوں کرتے ہیں:

"ستاروں نے ایک وقت ایسا بھی دیکھا کہ ترقیاتی ادارے کا سربراہ کاغذ پر جو بھی تھا حقیقت میں کوئی اور تھا! آج یہ شہر عبرت سرائے ہے۔ ظلمات کی آماجگاہ ہے۔ غلاظت اور گندگی کا ڈھیر ہے۔ مکین پریشان ہیں اور مکان غیر محفوظ، پانی ناپید ہے۔ نظافت عنقا ہے۔ جتنے ناکے ہیں اُس سے زیادہ ڈاکے ہیں۔ چوروں اور لٹیروں میں ہر سیکٹر خود کفیل ہے۔ دنیا میں یہ واحد دارالحکومت ہے جس کے وسط میں جی بارہ

سیکٹر جیسا جنگل آباد ہے، جہاں قانون کا گزر ناممکن ہے اور وزارتِ داخلہ تک کو علم نہیں کہ وہاں کون کون رہتا ہے اور کیا کیا کرتا ہے۔ کرۂ ارض پر یہ واحد صدر مقام ہے جس کی ایک بغل میں بارہ کہو ہے، جہاں سے اُن تین دنوں کے دوران جب صدر اشرف غنی آئے، تین لاکھ فون کالیں افغان ہوئیں اور دوسری بغل میں ترنول ہے جو وزیرستان کو مات کرتا ہے۔۔۔ آہ! اسلام آباد"!!![1]

محمد اظہار الحق نے اگرچہ کم کم لکھا ہے، مگر جو بھی لکھا ہے، باکمال اور لاجواب لکھا ہے اور اردو ادب کے دامن کو سیراب کیا ہے۔ اُن کی یہ خوبی ہے کہ اُنھوں نے سچ کے سوا کچھ نہ لکھا ہے۔ محمد اظہار الحق خواص میں رہنے کے باوجود عوام میں سے ہیں، اپنی دھرتی اور عوام سے اُن کا رابطہ کبھی بھی کم نہ ہوا ہے اور انھوں نے جو کچھ بھی لکھا ہے، وُہ عوام کے لئے ہی لکھا ہے اور عوام نے بھی اُن کے کام کی بھرپور پذیرائی کی ہے۔ ہر تحریر کا ایک مقصد ہوتا ہے کہ اسے دوسرے دیکھیں، پڑھیں اور اس تحریر سے مستفید ہوں اور لکھنے والے کے تجربات اور بیانات سے پڑھنے والوں کو بھی فائدہ پہنچے۔ بقول سید اقبال قادری:

"فکری تانے بانے لے کر یا چند حقائق کے ساتھ یا اپنے احساسات اور جذبات سمیت ہر لکھنے والا اپنی دماغی کاوش کا نتیجہ قلم کی مدد سے کاغذ پر منتقل کرتا ہے اور اس یقین کے ساتھ کہ جو کچھ اس کے قلم سے سادہ صفحہ پر لکھا جارہا ہے اِس کا اثر براہِ راست یا بالواسطہ دیگر دلوں اور دماغوں پر ہونے والا ہے"۔[2]

محمد اظہار الحق کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا ہے، وُہ اپنے خیالات، کام، فکر، سوچ اور تحریروں کی وجہ سے قارئین کے دلوں پر راج کرتے رہیں گے اور اُن کا کام اردو ادب کے افق پر جگمگاتا رہے گا۔

محمد اظہار الحق اپنے ایک کالم فیبرک میں یوں رقم طراز ہیں:

"ہم کہاں کھڑے ہیں؟ ایک لحظہ کے لیے سوچیے، ہم بائیس کروڑ ہیں، کیا بائیس کروڑ افراد پر بائیس کروڑ پولیس فورس کا تعین ممکن ہے؟ سیاست دانوں کو، لیڈروں کو علماء اور واعظین کو، میڈیا کو کیا الزام دے سکتے ہیں؟ اور کیسے دے سکتے ہیں؟ انسان اور جانور میں بنیادی فرق کسی لیڈر، کسی استاد، کسی پیر، کسی عالمِ دین، کسی واعظ، کسی سیاست دان، کسی لکھاری کا محتاج نہیں! ان پڑھ بھی اور کچھ نہیں تو انسان تو ہے! کیا اُسے معلوم نہیں کہ وعدہ پورا کرنا ہو گا، جھوٹ نہیں بولنا!!! میں اگر اپنے کیے ہوئے وعدے کا ذمہ ہی نہیں لیتا، میں اگر جھوٹ بولتا ہوں اور میرے اہلِ خانہ کے نزدیک

یہ سب کچھ معمول کا حصہ ہے تو میں اُس دھاگے کو کاٹ رہا ہوں جس سے معاشرے کی چادر بنی جاتی ہے! میں اُس بخیے کو ادھیڑ رہا ہوں، جس نے کپڑے کے ٹکڑوں کو جوڑ کر قمیض بنائی ہے۔ میں اپنے پیٹ پر پڑے ہوئے کپڑوں کو خود تار تار کر رہا ہوں اور ننگا ہو رہا ہوں! آپ اندازہ لگائیے، ہم میں سے ہر شخص اگر آج خدا اور رسول ﷺ کی اور اپنے ماں باپ کی عزت کی قسم اٹھا کر اپنے آپ سے وعدہ کرے کہ آج کے بعد وُہ(۱) اپنی ڈیوٹی پر بروقت پہنچے گا۔(۲)ڈیوٹی کے اوقات میں کوئی ذاتی کام نہیں کرے گا۔(۳)کسی صورت میں جھوٹ نہیں بولے گا۔۔۔ اور(۴)موت کے علاوہ کوئی شے اُسے وعدہ پورا کرنے سے نہیں روکے گی، تو آپ اندازہ لگائیے، ہم ایک ہی جست میں کہاں سے کہاں پہنچ جائیں گے!"[۱۲]

ج)۔ محمد اظہار الحق کے کالموں میں سیاست وعدل کا بیان:

سیاست

سیاست(Politics)"ساس" سے نکلا ہے، جو یونانی زبان کا لفظ ہے، اِس کے معنی شہر و شہر نشین کے ہیں۔ اسلام میں سیاست ایسے فعل کو کہتے ہیں جس کے انجام دینے سے لوگ اصلاح سے قریب اور فساد سے دور ہو جائیں جب کہ اہلِ مغرب کے نزدیک فنِ حکومت کو سیاست کہتے ہیں اور امورِ مملکت کا نظم و نسق بر قرار رکھنے والوں کو سیاست دان کہا جاتا ہے۔ قرآنِ کریم میں لفظ سیاست تو موجود نہیں ہے لیکن ایسی بہت سی آیات ضرور موجود ہیں جو سیاست کے مفہوم کو واضح کرتی ہیں، بلکہ قرآن کا کافی حصہ سیاست کے جملہ پہلوؤں پر مشتمل ہے، مثال کے طور پر عدل و انصاف، امر بالمعروف و نہی عن المنکر، مظلوموں سے اظہارِ ہمدردی اور اُن کی مکمل حمایت، ظالم اور ظلم سے نفرت اور اِس کے علاوہ انبیاء اور اولیاءِ کرام کا اندازِ سیاست بھی قرآنِ مجید میں بیان کیا گیا ہے۔ قرآنِ مجید میں سورۂ بقرہ میں ارشادِ خداوندی ہے، جس کا ترجمہ ہے:

"اُن کے پیغمبر نے کہا کہ اللہ نے تمہارے لیے طالوت کو حاکم مقرر کیا ہے۔ اُن لوگوں نے کہا کہ یہ کس طرح حکومت کریں گے۔ اِن کے پاس تو مال کی فراوانی نہیں ہے۔ اِن سے زیادہ تو ہم ہی حقدارِ حکومت ہیں۔ نبی نے جواب دیا کہ انھیں اللہ نے

تمھارے لیے منتخب کیا ہے اور علم و جسم میں وسعت عطا فرمائی ہے اور اللہ جسے چاہتا
ہے اپنا ملک دے دیتا ہے کہ وُہ صاحبِ وُسعت بھی ہے اور صاحبِ علم بھی"۔[۱۳]

اِس آیتِ کریمہ سے اُن لوگوں کے سیاسی فلسفہ کی نفی ہوتی ہے جو سیاست اور اقتدار کے لیے مال و دبدبہ کی فراوانی کو معیار قرار دیتے ہیں۔ اقتدار اور سیاست کے لیے ذاتی طور پر امارت کافی نہیں ہے بلکہ اسلامی احکامات وہدایات کے مطابق حکمران میں علم اور شجاعت کے اوصاف موجود ہونے ضروری ہیں۔ قرآن میں سیاست کے معنی حاکم کا لوگوں کے درمیان میں حق کے ساتھ فیصلہ کرنا، معاشرے کو ظلم و ستم سے نجات دینا، امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرنا اور رشوت وغیرہ کو ممنوع قرار دینا ہے اسی طرح حدیث میں سیاست کے معنی عدل و انصاف اور تعلیم و تربیت کے ہیں جب کہ علماء کی نظر میں رسول اللہ ﷺ اور خلفائے راشدین رضوان اللہ علیھم اجمعین کی سیرت وروش پر چلنا، استعمار سے جنگ کرنا، مفسدات سے روکنا اور بھلائی اور خیر کی نصیحت کرنا سیاست ہے جب کہ ماہرینِ فلسفہ کے نزدیک فنِ حکومت، اجتماعی زندگی کا سلیقہ اور صحیح اخلاق کی ترویج سیاست ہے۔ سیاست کسی گروہ یا مُقتدر لوگوں کی بنائی گئی ایسی پالیسی کو کہا جاتا ہے، جِس کا مقصد اپنے اقتدار یا اپنی بالا دستی کو یقینی بنانا ہوتا ہے۔ سیاست کی کئی اقسام اور کئی مقاصد ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر اقتدار کا حصول، حقوق کا تحفظ اور اُن کا حصول، مذہبی اقدار کا تحفظ، جمہوری روایات کا تحفظ اور ذاتی مفادات کا تحفظ۔

پاکستان کی عوام نے ابھی تک نہ تو ملکی سیاست کو ٹھیک سے سمجھنے کی کوشش کی ہے اور بد قسمتی سے نہ ہی ابھی تک پاکستانی عوام کو اصل جمہوریت اور جمہوری اقدار نصیب ہو سکی ہیں۔ پاکستان میں اب تک وُہ لوگ ہی برسرِ اقتدار رہے ہیں جِن کا سیاست اور عوامی خدمت سے حقیقت میں دُور نزدیک کا کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔

اِن تمام تعریفوں کے بعد حتمی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ لغت میں سیاست کے معنی حکومت چلانا اور لوگوں کی امر و نہی کے ذریعہ اصلاح کرنا ہے، جب کہ اصطلاح میں فنِ حکومت اور لوگوں کو اصلاح سے قریب اور فساد سے دور رکھنے کو سیاست کہتے ہیں۔ سیاست شروع سے ہی کالم نگاروں کا سب سے زیادہ پسندیدہ موضوع رہا ہے۔ اگر اب تک لکھے گئے سارے کالموں کو ایک جگہ جمع کر کے دیکھا جائے تو غالب امکان یہی ہے کہ سب سے زیادہ کالموں کا موضوع سیاست ہی ہو گا۔ کسی بھی اخبار کی خبر کا سب سے زیادہ اہم اور بنیادی موضوع

سیاست ہوتا ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ کسی اخبار کی وقعت اور اہمیت کے تعین میں اس کے سیاسی کالم سب سے زیادہ کلیدی کردار کے حامل ہوتے ہیں۔ قارئین کے نزدیک جن اخباروں کے سیاسی تجزیہ نگار زیادہ فہم و فراست اور دانش و بصیرت کا مظاہرہ کرتے ہیں، اُس اخبار کی عزت و وقعت میں بھی اُسی حساب سے اضافہ ہو جاتا ہے۔

عدل

"راغب اصفہانی کے نزدیک" عدل "مساوات کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔۔۔یعنی عدل برابری کی بنیاد پر تقسیم کرنا ہے"۔ [۱۴]

تحقیقی اعتبار سے عدل کا مادہ ایک ہی اصل میں استعمال ہوتا ہے۔ جِس کے معنی افراط و تفریط کا وسط اور درمیان کے ہیں یعنی اِس طرح سے کہ جس میں نہ تو کمی ہو اور نہ ہی اُس میں کسی قسم کی زیادتی ہو۔

اصطلاحی اعتبار سے علمِ فقہ، علمِ کلام اور علمِ نحو میں عدل کا لفظ مختلف معانی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

علمِ کلام میں عدل سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہی مکمل عادل ہے، ذرہ برابر بھی ظالم نہیں ہے۔

علمِ فقہ کے مطابق دین پر چلنے اور ممنوعات سے بچنے والا شخص عادل ہے۔ فیومی کے بقول:

"عدل "لفظ "جَور" کے متضاد معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ (جَور ظلم ہے اور ظلم کسی چیز کو اُس کے اپنے مقام کی بجائے دوسرے مقام پر رکھنا ہے"۔ [۱۵]

عدل ایک ایسی عظیم خوبی ہے جس پر اسلامی قواعد کی بنیاد رکھی گئی ہے بلکہ تمام مذاہب کے احکامات کی بنیاد یہی عدل ہے۔ عدل کے بغیر کوئی دین بھی مکمل نہیں ہوتا ہے اور نہ ہی انبیاء میں سے کسی نبی کی سچائی کو جانا جا سکتا ہے۔ عدل معاشرے کو ہر قسم کی بے راہ روی سے بچاتا ہے۔ بقول علامہ حلی:

"جب کوئی شخص اللہ کے عادل ہونے کا ایمان نہیں رکھے گا اور وُہ اپنی خواہشاتِ نفسانی کی پیروی کے نتیجے میں ایسے برے اور باطل عقائد کا شکار ہوتا چلا جائے گا تو وُہ اُن قبیح اور فاسد عقائد کے ساتھ کس طرح اپنے اللہ کا سامنا کر سکے گا"۔ [۱۶]

اپنے کالم "پاندان کی فکر" میں اظہار صاحب بیان کرتے ہیں کہ ہماری اسلامی تاریخ کتنی درخشندہ اور تابناک رہی ہے، امیر المؤمنین حضرت عثمان غنیؓ اور امیر المؤمنین حضرت علی کس قدر سیر چشم تھے، کہ مالِ غنیمت کی فراوانی کے باوجود اپنی ذات کے لیے کچھ لینا پسند نہ کرتے تھے بلکہ سب کچھ مسلمانوں میں برابر برابر تقسیم کروا دیتے تھے۔ محمد اظہار الحق کے مطابق:

"اور یہ تو قریب کے زمانے میں دنیا بھر نے دیکھا کہ گورنر جنرل ہو کر قائد اعظم ؒؒ محمد علی جناحؒ مہنگی جرابیں واپس کر دیتے ہیں، اُن کا پسندیدہ باورچی منگوایا جاتا ہے تو واپس بھجوا دیتے ہیں۔ گاڑی خریدنے سے بھی انکار کر دیا اور جہاز سے بھی۔ کہا میں کمرشل فلائٹ استعمال کروں گا یا ائر فورس کا طیارہ! پھر جب ساتھیوں نے قائل کیا تو قیمت کی فکر لگ گئی۔ قطب الدین عزیز نے سارا احوال لکھا ہے۔ انسان ورطہء حیرت میں گم ہو جاتا ہے کہ ایک ایک پائی کی فکر یوں دامن گیر ہے جیسے ذاتی جیب کی ہوتی ہے۔۔۔۔اور اب۔۔۔؟ یہ کون سی بد اعمالیاں ہیں کہ جن کی پاداش میں اب ہم پر وُہ لوگ مسلط ہو گئے ہیں بھوک جن کی آنکھوں سے نکلتی ہے نہ پسلیوں سے ۔جنہیں قومی خزانے کی تو کیا پروا ہو گی، اپنی عزت تک کی فکر نہیں! مگر بات یہ ہے کہ عزت کی تعریف کچھ لوگ اپنی خواہش کے مطابق کرتے ہیں۔ ایک سابق وزیر اعظم کے زمانے میں سیلاب زدگان کے لیے ترکی کے صدر کی اہلیہ نے اپنا قیمتی ہار عطیہ کیا تھا۔ سیلاب زدگان کو تو وہ کیا ملتا، پچھلے دنوں اُس کی ڈھنڈیا پڑ گئی۔ معلوم ہوا کہ سابق وزیر اعظم نے اسے اپنی ذاتی "تحویل" میں رکھا ہوا ہے۔ اب کہتے ہیں کہ ترکی جا کر واپس کروں گا، جیسے وُہ واپس لے ہی لیں گے! زمانے سے پوچھیں یا آسمان سے؟ یا اِس ملک کے اُس بخت سے جو سیاہ ہے، کہ ہمیں وہ رہنما کب میسّر آئیں گے جو اِس قبیل کی خفیف حرکتیں نہیں کریں گے۔ جو اپنی عزت کا اور قوم کی حرمت کا خیال رکھیں گے۔ جن کی اکھیاں اور وکھیاں خالی نہیں ہوں گی، بھری ہوئی ہوں گی"۔[۱۷]

اسی طرح محمد اظہار الحق جب حکمرانوں کی نااہلی اور بے حسی کی بات کرتے ہیں، تو بہت کھلے لفظوں میں اُن پر تنقید کرتے ہیں، اپنے کالم "دربارِ وطن میں جب اک دن" میں وہ بیان کرتے ہیں:

"قومی اسمبلی کی ایک جڑواں بہن سینٹ ہے! خوابِ خرگوش کی ایک اور مثال! ایک صاحب گیارہ سال اس کے سربراہ رہے! ہر حکومت کے حمایتی! مقصد صرف طولِ اقتدار تھا! عوام کو کیا دیا؟ اقتدار ڈھلا تو گھر میں اُن کے ساتھ وہی ہوا جو انھوں نے عوام کو دیا تھا! ڈاکو آئے، انھیں رسیوں سے باندھا! لوٹ مار کر کے چلے گئے۔

بعد میں ڈھنڈیا پڑی! ڈھنڈورا پٹا، جو ہونا تھا ہو چکا تھا! گیارہ سال آپ طاقت ور ترین ادارے کے سیاہ و سفید کے مالک رہے! پولیس ہی کو ٹھیک کرا جاتے! آج آپ کو بھی فائدہ ہوتا!"[۱۸]

اظہار صاحب نے اپنے کالموں میں ملک کے ہر طبقے اور حکومت کے ہر ادارے کے بارے میں لکھا ہے، انھوں نے منفی کاموں پر تنقید کے ساتھ ساتھ تعمیری اور مثبت کاموں پر تعریف بھی خوب کھل کر کی ہے، مگر بد قسمتی سے انھیں وطنِ عزیز میں تعمیر سے زیادہ تخریب ہی نظر آئی۔ اسی طرح اپنے کالم "انگریز کے اصل ذہنی غلام" میں وُہ ملکی اداروں کی تعریف اور اُن کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے افواجِ پاکستان کے بارے میں کچھ یوں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں:

"ہم سب جانتے ہیں کہ پاکستانی فوج نے جہاں جہاں چھاؤنیاں قائم کیں، وہاں تعلیمی ادارے قائم کیے اور صنعتیں بھی لگائیں۔ اٹک کے علاقے کو دیکھ لیجئے۔ انگریز پالیسی سازوں نے فیصلہ کیا تھا کہ اِس علاقے میں کارخانے لگائے جائیں گے نہ نہریں نکالی جائیں گی تاکہ نوجوان فوج میں بھرتی ہونے پر مجبور ہو جائیں اور جنگ کا ایندھن یہاں سے مہیا ہوتا رہے۔ یہ پاکستانی افواج کا کارنامہ ہے کہ اس علاقے میں صنعتوں کا جال بچھا دیا گیا۔ حویلیاں، واہ، سنجوال اور کامرہ میں درجنوں کارخانے لگائے گئے۔ لاکھوں لوگوں کو روزگار میسّر آیا۔ فوج نے بہترین تعلیمی ادارے قائم کیے۔ واہ میں شرح خواندگی ملک کی اعلیٰ ترین سطح پر ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ مسلح افواج کی محنت سے اس علاقے میں اقتصادی، صنعتی اور تعلیمی انقلاب آیا تو غلط نہ ہو گا۔۔۔ مگر آج جب ہماری مسلح افواج کا قبائلی علاقوں میں جانے کا ذکر ہوتا ہے تو کچھ لوگوں کا، جو انگریزوں کے ذہنی غلام ہیں، کا رنگ فق ہو جاتا ہے۔ اُن کے پیٹ میں مروڑ اٹھنا شروع ہو جاتے ہیں، کچھ کو تو دردِ قولنج کا عارضہ لاحق ہونے لگتا ہے اور کچھ صدمے کی شدت سے باقاعدہ صاحبِ فراش ہو کر مسہل لینے لگتے ہیں"۔[۱۹]

اظہار صاحب ملکی حالات کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی حالاتِ حاضرہ اور خطے کی صورتِ حال پر بھی بہت گہری نظر رکھتے ہیں اور اُن کی معاملہ فہمی بہت غضب کی ہے، آج سے کافی عرصہ پہلے اُنھوں نے اپنے ایک کالم "کاش! درمیان میں دیوار ہوتی" میں پاکستان میں امنِ عامہ کی صورتِ حال اور اُس کے اسباب کے بارے میں کچھ یوں اپنی رائے پیش کی ہے:

"اِس وقت پاکستان امن و امان کی جس تشویش ناک صورتِ حال سے دوچار ہے اُس کی ایک بہت بڑی وجہ پاک افغان سرحد ہے، کل ہی ایک معاصر نے لکھا ہے کہ سو افغان مہاجر پاکستان سے واپس جاتے ہیں تو پانچ سو داخل ہو جاتے ہیں۔ ہماری ریاستی نااہلی ہے کہ آج پاکستان کے ہر گوشے میں افغان پائے جاتے ہیں۔ یہ جائیدادیں بھی خرید لیتے ہیں اور ملازمتیں بھی ڈھونڈھ نکالتے ہیں۔ لاکھوں کروڑوں کے پاس پاکستان کے شناختی کارڈ اور پاسپورٹ موجود ہیں جو متعلقہ محکموں کی نالائقی، لاپرواہی اور کرپشن کا واضح ثبوت ہے۔۔۔ شام اور عراق کی فتح کے بعد امیر المؤمنین حضرت عمر فاروقؓ ایران کے ساتھ جنگ سے بچنا چاہتے تھے چنانچہ کہا کرتے تھے کہ کاش ہمارے اور اُن کے درمیان ایک دیوار کھڑی ہو جائے تاکہ ہم اُن کی طرف جا سکیں نہ وُہ ہماری طرف آ سکیں۔ یہ اور بات ہے کہ حالات و واقعات نے اِس جنگ سے بچنے نہ دیا۔ یہی صورتِ حال افغان پاکستان سرحد کی ہے۔ کاش ایک دیوار درمیان میں کھڑی ہو جائے تاکہ وُہ اپنے ملک میں رہیں اور ہم اپنے ملک میں"۔[۲۰]

محمد اظہار الحق نے موجودہ ملکی سیاست پر خوب کھل کر لکھا ہے، بد قسمتی سے ہمارے وطن میں حد سے زیادہ کرپشن ہے، نااہلی اور نالائقی انتہا درجے کی ہے، ایسی بے حسی ہے کہ وطنِ عزیز کی کسی کو فکر ہی نہیں ہے، ہمارے سیاست دانوں کو تو عوام کی فلاح و بہبود کا ذرہ برابر احساس ہی نہیں ہے۔ اپنے کالم "نندی پور! اے نندی پور" میں اُنھوں نے سیاست دانوں اور حکمرانوں کی ایسی ہی لوٹ کھسوٹ کا حال کچھ یوں بیان کیا ہے:

"نندی پور نے ایک اور بہت بڑی حقیقت پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی ہے۔ وُہ یہ کہ کرپشن، نااہلی، نالائقی کسی ایک حکومت تک محدود نہیں ہے۔ ساری سیاسی جماعتوں کی حکو ٍ متیں اِس ضمن میں ایک سی ہیں۔ زوال حکومت پر آیا نہ اہلِ سیاست پر۔ پوری قوم پر آیا ہے۔ پورا معاشرہ اپنی سمت کھو چکا ہے اور اعتدال کا دامن بھی۔ اِس معاشرے سے اب جو کچھ بھی نکلے گا، خواہ وُہ کوئی حکومت ہے یا کوئی سیاسی جماعت، خیر سے خالی ہی ہو گا۔۔۔ کیسی قوم ہیں ہم! پانی کا مسئلہ ہم سے حل نہیں ہو رہا۔ ڈیم ہم سے نہیں بن رہے۔ بجلی کا ایک پروجیکٹ تک ہنگامے، شور شرابے، باہمی طعن و تشنیع، الزام اور جوابی الزام کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔۔۔ نندی پور

صرف ایک قصبہ نہیں! ہمارا پورا ملک نندی پور ہے۔ ہم آپ سب نندی پور ہیں!
ہماری حکومت، ہمارے عوام اور ہمارے ادارے سب نندی پور ہیں!"[۲۱]

صحافت کا سب سے اہم اصول ہے کہ تحریر عام فہم ہو تا کہ کم پڑھا لکھا انسان بھی آسانی سے سمجھ سکے۔ اظہار صاحب کی عام فہم نثر نے اردو صحافت کو نیا مقام عطا کرنے میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔ عابد صدیقی کے بقول:

"صحافت حقائق سے راست طور پر آگاہی کا نام ہے۔ صحافتی مضامین کے لیے ناگزیر ہے کہ وہ سچائی، صداقت، صاف گوئی، آسان زبان و بیان، الفاظ کے کم استعمال اور غیر مبہم خیالات پر مبنی ہوں۔ ایسی تحریریں جو خیال کو واضح نہ کر سکیں صحافت میں شامل نہیں ہیں۔ تحریر میں چستی، روانی اور بے ساختگی کی کثرت بہترین صحافت کے معیار ہیں"۔[۲۲]

محمد اظہار الحق نے اپنے کالموں میں حکمران طبقے کی طرف سے غریب عوام کے ساتھ کی جانے والی زیادتیوں اور حق تلفیوں کے بارے میں بھی بہت کھل کر لکھا ہے، انھوں نے معاشرے میں رونما ہونے والے ایسے دل خراش واقعات کو عام قاری کے سامنے لا کر یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ ہمارے سیاست دان غریب عوام کا کس طرح سے استحصال کر رہے ہیں۔ محمد اظہار الحق اپنے کالم "وُہ جو دودھ سے بھری بالٹیاں گھروں کو لے گئے" میں لکھتے ہیں:

"غریب نواز صرف نام کا غریب نہیں تھا! اصل میں بھی غریب تھا۔ وُہ کرنل شجاع خانزادہ شہید کا ڈرائیور تھا۔ سولہ اگست کو جب نڈر کرنل خودکش حملے میں شہید ہوا تو غریب نواز کے سر پر بھی چوٹیں آئیں۔ وُہ بے ہوش ہو گیا۔ گیارہ دن ہولی فیملی ہسپتال میں کوما میں رہا۔ المیہ یہاں ختم نہیں ہو رہا بلکہ یہاں سے نئی کہانی شروع ہو رہی ہے۔ بے حسی، منافقت، سنگ دلی، تکبّر اور رعونت کی کہانی۔ ڈاکٹروں نے درخواست کی تھی کہ اسے علاج کے لیے امریکہ لے جایا جائے۔ پاکستانی ڈاکٹر بیرونِ ملک بھیجنے کی تجویز صرف اور صرف اُس وقت پیش کرتے ہیں جب انھیں وہاں جان بچنے کی امید ہو۔ خبر کا جو حصہ دل میں چھید کر دینے والا ہے، وہ یہ ہے کہ "علاج امریکہ میں کروانے کی تیاری کی جا رہی تھی۔"۔۔۔ اگر غریب نواز حاکم ہوتا، کسی صوبے کا وزیرِ اعلیٰ ہوتا، کسی اسمبلی کا رکن ہوتا، کسی حکمران کا رشتہ دار ہوتا، حرام کے مال سے اُس کی تجوریاں اور بنک بھرے ہوئے ہوتے تو گیارہ دن تو ایک طویل

عرصہ ہے، چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر "تیاری" مکمل ہو جاتی۔ کاغذات بھی بن جاتے۔ بیرونِ ملک ہسپتالوں اور ڈاکٹروں سے بھی رابطے ہو جاتے، ایئر ایمبولینس کا بندوبست بھی ہو جاتا۔ مگر غریب نواز تو ایک غریب ڈرائیور تھا! کیا کوئی وفاقی یا صوبائی اہلکار بتائے گا کہ اب تک کتنے حکمران اور حکمرانوں کے کتنے گماشتے سرکاری خرچ پر بیرونِ ملک علاج کرا چکے ہیں۔۔۔ کل جب غریب نواز کی شہادت کی خبر آئی، تو ساتھ ہی ایک معروف سیاستدان اور سابق وزیر کے بارے میں بھی خبر چھپی ہے کہ لندن کے ہسپتال میں زیرِ علاج ہیں۔ اگر ترازو میں اِس ملک کے لیے ایک طرف غریب نواز کی خدمات رکھی جائیں اور دوسری طرف لندن میں علاج کروانے والے اس سیاستدان جیسے "اشخاص" کی "کارکردگیاں" اور "خدمات" رکھی جائیں تو کیا عجب غیب کی قوت ترازو کا ایک پلڑا کہاں اور دوسرا کہاں لے جائے!!"[۲۳]

محمد اظہار الحق اپنے کالم "تلخ نوائی" میں ہمیشہ کڑوے سچ اور معاشرے میں موجود تلخ حقیقتوں سے اپنے قارئین کو آگاہی فراہم کرتے ہیں۔ "تلخ نوائی" واقعی اسمِ بامسمیٰ ہے۔ اپنے ایک کالم "شیر اور سرگوشی" میں وُہ ہمارے معاشرے کی اخلاقی اور مذہبی بیماریوں، گھناؤنے کرتوتوں اور حد سے بڑھی انسانی بے حسی اور بے توقیری کا احوال وہ یوں بیان کرتے ہیں:

"ناقابلِ بیان زیادتی بچوں کے ساتھ سال ہا سال سے ہو رہی ہے، ویڈیو بنائی جاتی رہی ہیں، اگر کوئی کہتا ہے اور سمجھتا ہے کہ پولیس والوں کو اِس سب کچھ کا علم نہیں تھا تو وُہ بے وقوف ہے یا دوسروں کو بے وقوف سمجھتا ہے! پولیس کی رضامندی کے بغیر شاید ہی کوئی جرم پنپ سکتا ہو! یہ وہی پولیس ہے جس کے بل بوتے پر انگریزوں نے ایک صدی تک صوبے پر حکومت کی۔ ہماری پولیس مجرموں کو پکڑنے میں، سراغ رسانی میں، انتظامی معاملات میں دنیا کی کسی بھی پولیس سے پیچھے نہیں۔ جاپان سے لے کر کینیڈا تک اور امریکہ سے لے کر نیوزی لینڈ تک کسی پولیس فورس سے اس کا مقابلہ کرا کے دیکھ لیں۔ اِس پولیس کا المیہ یہ ہے کہ سیاست دان اور حکمران طبقات اسے قومی فورس نہیں، خاندانی نوکر سمجھتے ہیں، اِس سے جرائم کرائے جاتے ہیں، مخالفین کا ناطقہ بند کرایا جاتا ہے، بچوں اور بیگمات اور اُن کے دوستوں اور سہیلیوں کی خدمت کرائی جاتی ہے۔ گھروں پر پہرے دلوائے جاتے ہیں، گھنٹوں شاہراہوں پر کھڑا رکھا

جاتا ہے تا کہ شاہی سواریاں اور خاندانی بگھیاں گزریں تو شان و شوکت اور تزک و احتشام کا مظاہرہ ہو اور حکمرانی کی تیز و تند روشنی سے عوام کی آنکھیں خیرہ ہو جائیں!"[۲۴]

محمد اظہار الحق اپنے کالموں میں جب پاکستان کے حکمرانوں کا موازنہ غیر ملکی حکمرانوں سے کرتے ہیں تو انھیں شدید مایوسی اور دکھ ہوتا ہے کہ ہمارے حکمران کس قدر غیر فعال اور سطحی ہیں، غیر مسلم حکمران اپنے ملک اور اپنی قوم سے کس قدر مخلص ہیں جب کہ ہمارے حکمرانوں کو اپنے ملک اور عوام سے کبھی بھی وُہ لگاؤ نہیں ہو سکا جو اصل میں ہونا چاہیے تھا۔ محمد اظہار الحق اپنے کالم "دو تصویریں" میں اپنا یہی درد بیان کرتے ہوئے بتاتے ہیں:

"اخبار کی ایک تصویر میں ہمارے ملک کے وزیر اعظم دارالحکومت میں ایک اجلاس کی صدارت کر رہے ہیں۔ یہ اجلاس خارجہ پالیسی کے بارے میں نہیں۔ نہ ملک کی صنعتی یا زرعی پالیسی کے متعلق ہے۔ اس کا موضوع ملک کا ناقص تعلیمی نظام ہے نہ ہر سال تباہی پھیلانے والے سیلابوں سے بچاؤ کا طریقہ، یہ اجلاس لاہور ائیر پورٹ کی توسیع کے بارے میں ہے! روس کے شہر اوفا میں "شنگھائی تعاون کونسل" کے سربراہ اجلاس سے واپس آ کر وزیرِ اعظم نے فوراً لاہور ائیر پورٹ کی توسیع کے متعلق اِس اجلاس کی صدارت کی۔ دوسری طرف بھارتی وزیرِ اعظم اوفا سے سیدھے ترکمانستان کے دارالحکومت اشک آباد پہنچے۔ ترکمانستان کی حکومت سے مذاکرات کے بعد مودی بشکیک گئے اور قازقستان اور بھارت کے درمیان چار معاہدوں پر دستخط کیے۔ بشکیک سے مودی، منزلوں پر منزلیں مارتے تاجکستان پہنچے، جب کہ اوفا جانے سے پہلے مودی قازقستان بھی گئے جہاں بھارت اور قازقستان کے درمیان پانچ معاہدوں پر دستخط کیے گئے۔۔۔ یہ ایک ہلکی سی جھلک ہے اُن معاملات کی، جو مودی نے وسط ایشیائی ریاستوں میں طے کیے۔ اِس کے مقابلے میں ہم کہاں کھڑے ہیں؟ ہم کیا کر رہے ہیں؟ اوفا سے وزیرِ اعظم واپس آتے ہیں اور لاہور ائیر پورٹ کے توسیعی منصوبے کے اجلاس کی صدارت کرتے ہیں۔ کیا یہ اِس بلند ترین سطح کا کام تھا؟"[۲۵]

د)۔ محمد اظہار الحق کے کالموں میں تاریخ و تمدن کا شعور:

تاریخ

تاریخ ایک ایسا مضمون ہے جس میں ماضی میں پیش آنے والے واقعات اور لوگوں کے حالاتِ زندگی کے بارے میں آگاہی ملتی ہے۔ تاریخ دان مختلف جگہوں سے اور مختلف ذرائع سے اپنی معلومات حاصل کرتے ہیں، جِن میں پرانے نسخے، شہادتوں اور پرانے سکوں و دیگر قدیم چیزوں کی تحقیق شامل ہے۔بقول ڈاکٹر آفتاب اصغر:

> "تاریخ کا لفظ عربی زبان سے نکلا ہے اور اپنی اساس میں آرخ سے ماخوذ ہے جِس کے معنی دن، عرصہ یا وقت وغیرہ کے ہیں۔ تاریخ نسلِ انسانی کے انفرادی اور اجتماعی کردار، اعمال اور افعال کا آئینہ دار ہے۔ تاریخ ،انسانی زندگی کے، مختلف شعبوں کے، گزشتہ نسلوں کے بیش قیمت اور یادگار تجربات آئندہ نسلوں تک پہنچاتی ہے تا کی انسانی تمدّن کا کارواں خوش اسلوبی سے رواں دواں رہے۔ تاریخ کا سب سے بڑا فائدہ یہی ہے کہ اِس کے مطالعے سے اقوام اور افراد اپنے ماضی کے دریچے میں جھانک کر اپنے کردہ اور ناکردہ اعمال و افعال پر تنقیدی نظر ڈال کر اپنے حال اور مستقبل کو اپنی مرضی و منشا کے مطابق ڈھال سکتے ہیں"۔[۲۶]

تاریخ کا تصور اُتنا ہی قدیم ہے جتنا کہ زمان و مکاں کا تصور ہے۔ آغازِ تمدن سے لے کر اب تک تاریخ نے کئی روپ دھارے ہیں۔ قصے کہانیوں سے شروع ہو کر آج تاریخ اِس نہج پر پہنچ چکی ہے کہ اِسے تمام علومِ انسانی کی روحِ رواں کہا جا سکتا ہے کیوں کہ عالمی سطح پر جب بھی کوئی خاص واقعہ پیش آتا ہے تو وُہ کسی نہ کسی طرح ماضی قریب یا ماضی بعید کی تاریخ سے مربوط ہوتا ہے، اِس لیے اگر یہ کہا جائے کہ تاریخ سب کچھ ہے اور سب کچھ تاریخ ہے تو بے جا نہ ہو گا۔ تاریخ کے بارے میں کئی نظریات ہیں۔ ابنِ خلدون کا کہنا ہے کہ یہ ایک ایسا علم ہے جو کسی خاص عہدِ ملت کے حالات و واقعات کو موضوعِ بحث بناتا ہے۔ اناتول قراش کے خیال میں تاریخ گزشتہ اتفاقات و حادثات کا تحریری بیان ہے۔ ای ایچ کار کی رائے میں تاریخ تحقیق شدہ واقعات کے ایک

سلسلے کا نام ہے۔ کارل بیکر کے نزدیک تاریخ اقوال و افعال کا علم ہے۔ سیلی کی رائے میں تاریخ گزشتہ سیاست ہے اور گزشتہ سیاست موجودہ تاریخ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تاریخ کے نظریات میں کتنا ہی اختلاف ہو، مگر اِس حد تک سب متفق ہیں کہ تاریخ ایک ایسا علم ہے جو عہدِ گزشتہ کے حالات و واقعات کی معلومات آئندہ نسلوں تک بہم پہنچاتا ہے یہی وجہ ہے کہ تاریخ اتنا ہی قدیم علم ہے جتنا کہ تحریر۔ قوموں کو مہذب بنانے میں مذہب اور فنِ تحریر کا حصہ بہت نمایاں ہے۔ قدیم ترین اقوام میں مذہبی تصورات کے ساتھ ساتھ فنِ تحریر کو جس طرح رائج کیا گیا وُہ حیرت انگیز ہونے کے علاوہ نہایت کارآمد بھی رہا۔ شروع میں تصویری تحریر رائج ہوئی۔ تصویریں بنا کر انسان نے اپنی ضروریات اور خیالات کا اظہار کیا۔ تصویری تحریر کا سہرا مصریوں کے سر جاتا ہے، اُنھوں نے اپنی تحریر کو تقریباً چھ سو نشانیوں میں سمیٹ دیا تھا۔ پھر یہ نشانیاں حروف میں تبدیل ہوتی چلی گئیں اور اپنے ارتقاء کا سفر طے کرتے کرتے تحریر موجودہ شکل تک آ پہنچی ہے۔ بقول پروفیسر عمر زبیری:

> "قدیم قومیں اور ملک اگر ترقی کا سفر اختیار نہ کرتے تو موجودہ دنیا اِس منزل تک نہ پہنچ سکتی، جس منزل پر آج ہے۔ پتھر کے زمانے سے لے کر موجودہ عہدِ جدید تک انسان مسلسل ترقی ہی کرتا رہا ہے اور تاریخ یہ بتاتی ہے کہ آئندہ بھی وُہ ترقی ہی کرتا رہے گا"۔[۲۷]

تمدن

تمدن کے معنی ہیں شہر میں آنا یا رہنا یا شہری زندگی اختیار کرنا یا مضافات میں شہر کا رنگ پیدا کرنا یا مل کر رہنے کا طریقہ اختیار کرنا یا شہری طرزِ معاشرت اپنانا۔ تاریخ دانوں کے خیال کے مطابق تہذیب اور تمدن کی نشوونما اُن وادیوں میں ہوئی جن میں پانی کی فراوانی تھی اور جہاں کی مٹی زرخیز تھی۔ سامری، بابلی، آشوری، کلدانی اور آریائی تہذیبیں دنیا کی قدیم ترین تہذیبیں ہیں۔ تاریخ کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ انسان نے ہمیشہ مشکلات پر قابو پانے کی کوشش کی اور جیسے جیسے وہ مشکلات پر حاوی ہوتا چلا گیا وہ ترقی یافتہ اور متمدن ہوتا گیا۔ پروفیسر ٹائن بی کہتے ہیں:

"انسان کے متمدن ہونے کی وجہ صرف یہ نہیں تھی کہ وُہ دوسری مخلوقات سے زیادہ بہتر تھا بلکہ انتہائی مشکل حالات میں گھر کر انسان نے اُن مشکلات کا مقابلہ جس بہادری اور ہمت سے کیا اُس ہمت و پامردی نے انسان کو متمدن بنا دیا"۔[۲۸]

تہذیب و تمدن کی ترقی کے معنی یہ ہیں کہ انسان آہستہ آہستہ تہذیب یافتہ بنتا چلا گیا، اُس نے قدرتی وسائل کو اپنے ہاتھوں میں لے کر زندگی کو آسان اور بتدریج بہتر سے بہترین کر دیا، ساتھ ساتھ زندگی میں نظم و نسق قائم کیا۔ اصولوں، روایات اور قانون کا احترام سیکھا اور معاشرہ میں جان و مال کی حفاظت کی ذمہ داری بخوبی نبھائی۔

انسان جب بربریت اور جہالت کے دور میں تھا تو اُس میں اور جانوروں میں کوئی فرق نہیں تھا لیکن انسانی دماغ میں ترقی کی صلاحیت رکھی گئی تھی اور اِسے سوچنے اور سمجھنے کی قوت عطا کی گئی تھی۔ انسان نے جنگلی زندگی اور خونخوار جانوروں کے مقابلے میں اپنے دماغ کو استعمال کیا، پتھر کو ہتھیار کے طور پر استعمال کیا نیز اس سے آگ کی چنگاری پیدا کی، جنگلی جانور اُس سے خوف زدہ ہو گئے اور یوں انسان جانوروں سے برتر ہوتا چلا گیا۔ اسی طرح انسان کے اندر ملکیت کا احساس پیدا ہوا، وہ عورت اور اولاد کو "اپنا" سمجھنے لگا اور ان کی حفاظت کی ذمہ داری سنبھالی، اِس طرح خاندان کی ابتدا ہوئی۔ خاندان سے قبیلہ، قبیلوں سے علاقہ، علاقوں سے ملک اور ملکوں سے برِّاعظم وجود میں آتے چلے گئے اور انسان مہذب اور متمدن ہوتا چلا گیا۔ محمد اظہار الحق کے کالموں میں تاریخی اور تمدنی موضوعات اور شعور جگہ جگہ ملتا ہے، مثال کے طور پر اپنے ایک کالم "مہاتیر محمد" میں وُہ کچھ یوں لکھتے ہیں:

"مغربی پریس کا دعویٰ ہے کہ سنگاپور اور چین کے رہنماؤں کو چھوڑ کر اِس وقت ایشیا میں کوئی ایسا رہنما نہیں ہے جو مہاتیر محمد جیسے مضبوط عزائم رکھتا ہو۔ اِس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ ملائیشیا کی نصف آبادی شہروں میں رہائش پذیر ہے، فی کس آمدنی پچھلے چھ سالوں میں دوگنا بڑھ چکی ہے۔ دنیا کی بلند ترین عمارت ملائیشیا کے دارالحکومت کوالالمپور میں زیرِ تعمیر ہے۔ چوڑائی میں دنیا کی سب سے بڑی عمارت

ملائیشیا میں بنائی جارہی ہے، جو دو کلو میٹر چوڑی ہو گی، کوالالمپور کے حد سے زیادہ گنجان ہونے کی وجہ سے دارالحکومت نیا بنایا جارہا ہے۔ کمپیوٹر اور جدید آلات سے متعلق صنعتیں لگانے کے لیے وسیع پیمانے پر سرمایہ کاری ہو رہی ہے، یہاں تک کہ مہاتیر محمد نے مائیکروسافٹ کے ایشیائی ہیڈ کوارٹر کو سنگاپور سے ملائیشیا میں منتقل کروانے کا بندوبست کر لیا ہے۔۔۔ مہاتیر محمد ایشیا کے واحد لیڈر ہیں جنھوں نے مغرب کے متعصّبانہ رویوں کی کھل کر مذمت کی ہے۔ مہاتیر محمد کے والد ایک استاد تھے، انھوں نے ایک چھوٹے سے عام گھر میں پرورش پائی ہے، اگر وہ موروثی جاگیر دار ہوتے اور اُن کا تعلق امراء کے طبقہ سے ہوتا تو ان کا زاویہء نظر بھی مختلف ہوتا اور غالباً ملائیشیا آج بھی وہیں ہوتا جہاں پہلے تھا لیکن مہاتیر محمد نے اس کی قسمت بدل ڈالی اور تاریخ کے اس اٹل اصول پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی کہ انقلاب ہمیشہ متوسط طبقہ کے افراد لاتے ہیں۔ اے خدا پاکستان کو بھی کوئی مہاتیر محمد عطا کر دے"۔[۲۹]

محمد اظہار الحق نے اپنی کالم نگاری میں وطنِ عزیز سے ہٹ کر دیگر ممالک کے دانش وروں اور حکمرانوں کی بھی تعریف کی ہے اور اُن کے اچھے کاموں کے بارے میں اپنے کالموں میں لکھا ہے، چاہے وہ دنیا کے جس حصے میں بھی رہتے ہوں اور کسی ملک کے لیے بھی اپنی خدمات سرانجام دے رہے ہوں، اِس سلسلے میں ایک نام مہاتیر محمد کا بھی ہے۔ اسی طرح اپنے کالم "بلوچستان۔۔۔ اندھوں کے نرغے میں ہاتھی" میں محمد اظہار الحق رقم طراز ہیں:

"آج چالیس سال بعد بلوچستان کو مشرقی پاکستان سے تشبیہ دی جا رہی ہے۔۔۔ مشرقی پاکستان اور بلوچستان کو ایک دوسرے کے مماثل قرار دینے کا کوئی جواز نہیں۔ جغرافیائی طور پر اور نہ ہی سماجی لحاظ سے۔ بلوچستان اور باقی پاکستان کے درمیان زمینی بُعد نہیں، جیسا کہ مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے درمیان تھا۔ مشرقی پاکستان اِس بدترین سرداری اور جاگیر دارانہ نظام کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا جس

نے بلوچستان کو ایک خوفناک اژدھے کی طرح اپنی گرفت میں لیا ہوا ہے۔ شیخ مجیب الرحمٰن کے چھ نکات دفاع، خارجہ امور، کرنسی، مالیاتی پالیسی اور تجارتی حسابات کے بارے میں تھے جب کہ سردار اختر مینگل کے چھ نکات لاپتہ افراد، لاشوں اور بے گھر افراد سے متعلق ہیں۔۔۔ سردار اختر مینگل کے چھ نکات سے ہر وہ شخص متفق ہے، جسے پاکستان اور بلوچستان سے محبت ہے۔ لاپتہ افراد بازیاب ہونے چاہئیں اور ضرور ہونے چاہئیں ۔ ذمہ داروں کے خلاف کارروائی ہونی چاہیے۔ اکبر بگٹی کے قاتل کیفرِ کردار کو پہنچنے چاہئیں، تاہم اس حقیقت کا اعتراف بھی ضروری ہے کہ یہ بیماری کی علامات ہیں، بیماری کے اسباب نہیں۔ جب تک سرداری اور جاگیر دارانہ نظام میں اصلاحات نہیں کی جاتیں، بلوچ عوام عملی طور پر غلامی ہی کی زندگی گزارتے رہیں گے"۔[۳۰]

محمد اظہار الحق نے پاکستان کے علاوہ امتِ مسلمہ اور خطے کے دیگر مسائل کے بارے میں بھی کھل کر لکھا ہے اور صحیح معنوں میں حقیقت کی ترجمانی کی ہے۔ ان کی کالم نگاری کی ایک خوبی حقیقت پسندی اور بے لاگ رائے ہے۔ اگر کسی غیر مسلم میں بھی محمد اظہار الحق کو کوئی وصف نظر آتا ہے، تو وُہ اُس کی دل کھول کر تعریف کرتے ہیں اور اگر کسی مسلمان میں بھی اُنھیں کوئی خامی نظر آتی ہے تو برملا اُس کا اظہار کر دیتے ہیں۔ بقول عبد الحئ:

"ایک کامیاب صحافی بننے کے لیے صحافی کا دولت مند ہونا ضروری نہیں ہے بلکہ اُس کی ذہنی استعداد، سچی لگن اور اور حوصلہ مندی اسے ایک کامیاب صحافی بناتی ہے۔ سب سے اہم بات یہ کہ صحافت کا ایک مقصد ہو تبھی صحافی ایک اچھا، نڈر اور بے باک صحافی بن سکتا ہے"۔[۳۱]

محمد اظہار الحق میں حق گوئی، بے باکی اور پیشہ وارانہ دیانت جیسی خصوصیات بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ اپنے کالم "شاہراہ اور پگڈنڈیاں" میں محمد اظہار الحق نے افغانستان کے امن و امان اور طالبان کے کردار کے بارے میں معلومات فراہم کرتے ہوئے بتایا ہے:

"خدا ملا عمر کو اپنی بے پایاں رحمتوں سے ڈھانپ لے اور ان کی قبر کو مغفرت کے نور سے منور کرے۔ مسلمانوں کو پستی کی ذلت اور زوال کے گڑھے سے نکالنے والا لیڈر اُن جیسا نہیں ہو گا۔ ہر گز نہیں! اُسے عصرِ حاضر کے تقاضوں کا پورا ادراک ہو گا۔ وُہ عسکری پہلوؤں کے ساتھ ساتھ معاشرتی، سیاسی اور اقتصادی گتھیوں کو بھی سلجھائے گا۔ اُس کے پاس کرۂ ارض کے ملکوں، ان کی پالیسیوں اور ان کی قوت اور کمزوریوں کے بارے میں تازہ ترین معلومات ہوں گی۔ اُس کا فہمِ اسلام اپنے مسلک اور چند ظاہری امور تک محدود نہیں ہو گا۔ وُہ سائنس اور ٹیکنالوجی کو وہی اہمیت دے گا جو دینی چاہیے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ جو مخلوقِ خدا اُس کے دائرہ اختیار کے اندر بستی ہو گی، وہ اُس کی بقا، فلاح، مسرت اور اطمینان کا ذمہ دار ہو گا! وہ نیکر پہن کر فٹ بال کھیلنے والے غیر ملکیوں کے سر مونڈنے کا مضحکہ خیز حکم نہیں دے گا۔ وُہ خواتین کو سرِعام مارنے کی اجازت کبھی نہیں دے گا، نہ ہی وہ اُن کی ملازمتیں چھڑوا کر انھیں بے دست و پا جانوروں کی طرح کھونٹوں سے باندھ دے گا! نہ ہی وہ اپنے لوگوں کو مصیبت کے وقت بے یار و مددگار چھوڑ کر چھپ جائے گا۔ لیڈر وہ ہوتا ہے جو اپنے پیروکاروں کے ساتھ زندگی گزارتا ہے اور ساتھ مرتا ہے!"[۳۲]

محمد اظہار الحق نے ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کے تناظر میں بھی بہت کچھ لکھا ہے، اُن کے کالموں میں تاریخ سے رغبت کا پتہ ملتا ہے، ساتھ ساتھ اُن کے کالم حب الوطنی کا بھی درس دیتے ہیں، اپنے ایک کالم "اسلم" میں وہ پاک بھارت جنگ کا ذکر کچھ یوں کرتے ہیں:

"پاکستان آرمی کی قیادت اُس وقت جنرل موسیٰ کر رہے تھے۔ سردار یزدان خان کا یہ قابلِ فخر سپوت جس نے بھارتی جارحیت کو ذلت سے دوچار کیا، کوئٹہ سے تھا اور ہزارہ قبیلے کا چشم و چراغ! مجید امجد نے ۱۹۶۵ء کی جنگ پر ایک نظم کہی تھی، جس میں دولت کی ہوس رکھنے والوں کو خطاب کیا تھا، انھیں معلوم نہ تھا کہ پاکستان پر وہ وقت بھی آئے گا جب یہ ہوس پاگل پن کی آخری حدوں سے بھی آگے نکل جائے

گی۔ ہسپتالوں کی ایمبولینسوں میں اسلحہ ڈھویا جائے گا۔ مریضوں کو زہر کے انجکشن لگیں گے۔ گدھے لاکھوں کی تعداد میں "ذبح" کیے جائیں گے۔ لیڈروں کے محلات لندن سے دبئی تک پھیل جائیں گے۔ وقت کے وزیر اعظم کے اثاثے حکومت میں آنے کے بعد ایک سال میں ساٹھ کروڑ بڑھیں گے۔ اِس ریاست کو ایسا صدر بھی ملے گا جو اپنے ساتھیوں کی پیٹھ ٹھونکے گا کہ لوٹو! جتنا لوٹ سکتے ہو لوٹو! ایسے سابق وزیر اعظم ہوں گے جو شرم ناک کرپشن کے مقدموں میں ضمانت لیں گے تو ہنستے ہوئے وکٹری کا نشان بنائیں گے۔ کیا اسلم نے ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ میں اپنی جان اِس لیے قربان کی تھی؟"[۳۳]

محمد اظہار الحق نے نہ صرف پاکستان کے مشاہیر کے بارے میں لکھا ہے بلکہ اگر انھیں باہر کے کسی ملک کی، کسی ہستی میں کوئی سبق نظر آیا ہو تو انھوں نے کسی تعصب کے بغیر کھل کر اُس کی بھی تعریف کی ہے، مثال کے طور پر اپنے کالم "جزیرہ اور املی کے بیج" میں محمد اظہار الحق نے بھارت کے گیارھویں صدر "عبد الکلام" کے حالاتِ زندگی بیان کرتے ہوئے بتایا ہے کہ وہ اپنی محنت، لگن اور مستقل مزاجی سے کس طرح ترقی کرتے کرتے، چھوٹے سے گاؤں سے باہر نکل کر ہندوستان کے صدر کے عہدے تک جا پہنچے۔ محمد اظہار الحق اپنے کالم میں قارئین کو بتاتے ہیں:

"عبد الکلام نے بھارت کی جارحانہ اور دفاعی قابلیت کو زمین سے اٹھا کر آسمان تک پہنچا دیا اور مسلسل کئی عشرے جنگی تیاریوں کی قیادت کی، اگرچہ عبد الکلام کا تعلق ہمارے دشمن ملک سے ہے مگر اِس کے باوجود عبد الکلام کی زندگی میں ہمارے لیے کئی سبق ہیں۔ وُہ جو عربی میں کہتے ہیں کہ غور اِس پر کرو کہ کیا کہا گیا ہے، یہ نہ دیکھو کہ کہنے والا کون ہے۔ ہمارے لیے اور ہمارے رہنماؤں کے لیے بہت بڑا سبق عبد الکلام کی وہ بے نیازی ہے جو اُس نے دنیاوی مال و متاع، بینک بیلنس، جائیداد، مکان اور مال و دولت سے برتی۔ جِن اٹیچی کیسوں کے ساتھ وہ بھارت کے ایوانِ صدر میں داخل ہوا۔ پانچ سال بعد انھی اٹیچی کیسوں کے ساتھ وہاں سے رخصت ہوا، بطورِ

سابق صدر جب اُس سے پسند کی رہائش کا پوچھا گیا تو اُس کا واحد مطالبہ یہ تھا کہ اُس کی لائبریری کے لیے جگہ موجود ہو۔ کوئی بزنس کیا، نہ آبِ رواں کے کنارے کوئی محل بنایا۔ اُس کے بھائیوں اور بہنوئی کے اُس پر کئی احسانات تھے، مگر اُس نے اپنی بلند حیثیت میں اُن کی کوئی سفارش کی نہ اُن کی "قسمت" بدلنے کی کوشش کی"۔ [۳۴]

محمد اظہار الحق نے چونکہ ڈھاکہ یونیورسٹی سے پڑھا تھا اور معاشیات میں ماسٹر ڈگری وہیں سے حاصل کی تھی، اِس لیے سقوطِ ڈھاکہ کی وجوہات سے وہ زیادہ بہتر طور پر آگاہ تھے، اور اُن کو اسی لیے ملک ٹوٹنے کا رنج بھی اوروں کی نسبت زیادہ تھا، اپنے اِس درد کو انھوں نے اپنی کالم نگاری میں خوب صورتی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اظہار صاحب ایک سچے، کھرے اور بے باک صحافی ہیں، انھوں نے ہمیشہ صحافت کے تقدس کا خیال رکھا ہے۔ صحافی ہونے کے ناطے وہ اِس پیشے کے اصولوں اور ضابطوں سے واقف ہیں۔ بقول عبدالحئ:

"ایک صحافی کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ عوام کو، اپنے قاری کو تمام باتوں سے باخبر رکھے اور اس کے علاوہ دوسری عوامی دلچسپی کی چیزوں پر بھی نظر رکھے"۔ [۳۵]

بلاشبہ یہی کام محمد اظہار الحق نے اپنے کالموں میں کیا ہے اور اپنے قارئین کو کڑوے سچ سے ہر ممکن حد تک آگاہی فراہم کی ہے۔ اپنے کالم "ڈھاکہ! ہم شرمندہ ہیں" میں محمد اظہار الحق سقوطِ ڈھاکہ کے قومی المیے کو کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

"ڈھاکہ! تو ہم سے اس لیے روٹھا تھا کہ مشرقی پاکستان کے عوامی نمائندے اعلیٰ تعلیم یافتہ اور متوسط طبقے کے تھے اور ہمارے (مغربی پاکستان کے) نمائندے ان پڑھ، نیم خواندہ، جاگیر دار، سردار، خان، وڈیرے اور چودھری تھے اور تعلیم یافتہ لوگوں کی ، منشی کہہ کر تحقیر کرتے تھے۔ افسوس! ہم آج چار دہائیوں کے بعد بھی ویسے کے ویسے ہی ہیں۔ ہماری سیاست، زراعت اور سماج پر وڈیرہ شاہی آج بھی اپنے مکروہ پنجے گاڑے ہوئے ہے۔ آج بھی لغاری، مزاری، جتوئی، چودھری، میر، سردار اور خوانین پیرانِ تسمہ پا کی طرح ہماری گردنوں پر سوار ہیں ۔ آج بھی عوام کی "نمائندگی" وہی خاندان کرتے ہیں جو طاقت ور تھے اور طاقت ور ہیں"۔ [۳۶]

محمد اظہار الحق حب الوطنی کے جذبے سے سرشار ہیں اور اپنے وطن سے محبت کا اظہار وہ اپنے کالموں میں اکثر کرتے ہیں۔ اپنے کالم "سقوطِ ڈھاکہ" میں محمد اظہار الحق پاکستان کے دولخت ہونے کا دکھ کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

> "ڈھلتی شام تھی۔ ڈھاکہ یونیورسٹی کی لائبریری میں، جو چوبیس گھنٹے کھلی رہتی تھی، ہم سب بیٹھے کتابوں میں غرق تھے۔ میں اور میرے مشرقی پاکستانی دوست نے کتابیں اور کاغذ وہیں میزوں پر رکھے اور کینٹین کی طرف چل دیے۔ مادھو کی کینٹین! جو ۱۹۲۱ء سے ڈھاکہ یونیورسٹی کی ثقافتی، علمی اور سیاسی سرگرمیوں کا مرکز رہی ہے اور جس کی دردناک کہانی ایک الگ مضمون مانگتی ہے۔ میرے دوست کا مجھ سے ایک ہی سوال تھا اور بہت واضح اور غیر مبہم سوال تھا۔ "اظہار! مجھے بس اتنا بتا دو، گیارہ سال ایوب خان کی آمریت رہی۔ اب ایک اور فوجی ڈکٹیٹر آ گیا ہے۔ جرنیل پنجابی ہیں یا پٹھان۔ جن علاقوں میں انگریزوں کا مقابلہ کیا گیا، بنگال، یوپی اور سندھ۔ وہاں کے لوگوں کو فوج کے لیے "غیر مناسب" قرار دے دیا گیا۔ ہم جرنیل کہاں سے لائیں گے؟ تو کیا ہماری باری کبھی نہیں آئے گی؟ آج سولہ دسمبر ہے۔ مشرقی پاکستان کو الگ ہوئے بیالیس سال ہو گئے ہیں۔ میں آج تک اپنے دوست کو اُس کے سوال کا جواب نہیں دے سکا"۔[۳۷]

تاریخ ہر زمانے میں قارئین کے لیے پسندیدہ موضوع رہا ہے، ایک عام قاری بھی تاریخ سے دلچسپی رکھتا ہے، اور تاریخ سے متعلقہ کالموں کو شوق سے پڑھتا ہے۔ امداد صابری اِس بارے میں کہتے ہیں:

> "ایک صحافی مؤرخ اور ناقد کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ مؤرخ ہی نہیں بلکہ قوم و ملک کے خیالات و حالات اور ماحول کو بنانے اور سدھارنے، بدلنے اور بگاڑنے کی بھی طاقت رکھتا ہے"۔[۳۸]

محمد اظہار الحق نے چونکہ باقاعدہ طور پر ازبک زبان سیکھ رکھی ہے، اِس لیے وہ وسط ایشیا اور خصوصاً ازبکستان کے ادب، تاریخ اور ثقافت کے بارے میں زیادہ بہتر جانتے ہیں، اُن کو اِسی وجہ سے ازبکستان اور دیگر وسط

ایشیائی ریاستوں کی طرف سے اکثر کانفرنسوں میں شرکت کی دعوت اور مواقع ملتے رہتے ہیں۔ اپنے کالم " تاشقند سے خوارزم اور ترمذ تک " میں وہ وسط ایشیا کے عظیم حکمران سلطان جلال الدین خوارزم شاہ کے بارے میں لکھتے ہیں:

"یوں بھی جلال الدین خوارزم شاہ کی داستان اتنی حیرت انگیز ہے کہ تاریخ آج تک اِس کے سحر سے نہیں نکل سکی۔ چنگیز خان کا ٹڈی دل لشکر جو روئے زمین پر اُس وقت عذابِ الٰہی کی طرح تھا ہر طرف یوں بڑھ رہا تھا کہ رکنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا لیکن جلال الدین خوارزم شاہ پہاڑ کی طرح ڈٹ گیا، لاکھوں کی تاتاری فوج کو خوارزم پر قبضہ کرنے میں سات مہینے لگ گئے۔ جلال الدین اُس وقت کرۂ ارض پر واحد حکمران تھا جس نے تاتاریوں کو پے در پے شکستیں دیں لیکن اُس کے ساتھی دن بدن کم ہو رہے تھے، جلال الدین خوارزم شاہ نے اُس وقت کی مسلمان سلطنتوں کو مدد کے لیے پکارا لیکن اُس کی پکار کا انجام وہی ہوا جو ٹیپو سلطان کی پکار کا ہوا تھا۔ چنگیز خان جلال الدین کو پکڑنے کے لیے خود آیا۔ اٹک کے قریب دریائے سندھ کے کنارے پیچھے چنگیز خان کا لشکر تھا اور سامنے تیس فٹ گہرا ٹھاٹھیں مارتا دریائے سندھ۔ ہتھیار ڈالنے کے سوا کسی اور راستے کا دور دور تک کوئی امکان نہیں تھا، لیکن شکست کا لفظ جلال الدین خوارزم شاہ کی لغت میں نہیں تھا، اُس نے گھوڑے سمیت دریا میں چھلانگ لگا دی اور ایک ہاتھ میں ڈھال پکڑ کر اپنے آپ کو تیروں سے بچاتا اور دوسرے ہاتھ سے خوارزم کا پرچم لہراتا دوسرے کنارے پہنچ گیا۔ چنگیز خان اور اُس کی افواج اِس ناقابلِ یقین منظر کو دیکھ کر دنگ رہ گئیں۔ اِس موقع پر چنگیز خان نے جلال الدین کی طرف اشارہ کر کے اپنا مشہور تاریخی فقرہ کہا کہ " کیا ہی خوش قسمت شخص ہو گا جس کو ایسا بیٹا ملا ہے "۔[۳۹]

تاریخ سے آگاہی اور تھوڑا سا شغف رکھنے والا ایک عام قاری بھی تاریخ کی اہمیت اور افادیت کو اچھی طرح سے جانتا ہے اور سمجھتا ہے کہ قوموں کے عروج و زوال میں تاریخ کتنی خاص حیثیت کی حامل ہوتی ہے۔ بقول امداد صابری:

> "ایک صحافی مؤرخ اور ناقد کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ مؤرخ ہی نہیں بلکہ قوم و ملک کے خیالات و حالات اور ماحول کو بنانے اور سدھارنے، بدلنے اور بگاڑنے کی بھی طاقت رکھتا ہے"۔ [۴۰]

اسی طرح محمد اظہار الحق جب تاریخ کا ذکر کرتے ہیں تو تفصیل سے اور دلچسپ پیرائے میں کرتے ہیں، قاری خود کو اُسی دور میں محسوس کرتا ہے۔ اپنے ایک کالم "ہرات" میں وُہ اِس تاریخی شہر کا ذکر کچھ یوں کرتے ہیں:

> "ہرات شہر نہیں تھا ہیرا تھا اور کون سا حکمران تھا جو اِس ہیرے کو اپنے تاج پر نہیں لگانا چاہتا تھا۔ چوتھی صدی قبل مسیح میں سکندرِ اعظم نے یہاں قلعہ تعمیر کرایا جو آج بھی موجود ہے۔ گیارھویں اور بارھویں صدی میں سلجوقیوں نے جنھوں نے محمود غزنوی کے وارثوں کا تختہ الٹا تھا ہرات پر حکومت کی۔ پھر غوری آئے تو ہرات اُن کے لیے بھی زندگی اور موت کا مسئلہ تھا۔ پھر ہرات پر خوارزم شاہ کا جھنڈا لہرانے لگا۔ پھر تاتاریوں کا سیلاب آیا اور دنیائے اسلام کے جن حصوں کو بہا کر لے گیا اُن میں ہرات بھی تھا۔ چنگیز خان نے شہر کو اپنے بیٹے کی تحویل میں دے دیا۔ اہلِ ہرات نے بغاوت کی اور شہر واپس چھین لیا۔ چنگیز خان کی آنکھوں میں خون اتر آیا، اُس نے اسی ہزار تاتاریوں کے ساتھ چھ ماہ تک شہر کا محاصرہ کیا اور پھر وُہ تباہی آئی کہ صرف چالیس شہری زندہ بچے۔ چودھویں صدی کے آخر میں تیمور لنگ نے اِسے کھنڈر میں تبدیل کر دیا لیکن خدا کی قدرت کہ کھنڈر بنانے والے تیمور ہی کے بیٹے شاہ رُخ نے اِسے نکتہء کمال پر پہنچایا۔ تیموریوں کے عہد میں ہرات تمدن کے عروج پر تھا۔ شہرہء آفاق شاعر جامی اور عظیم مصور بہزاد اُسی زمانے میں ہرات میں پیدا ہوئے اور آج تک زمانے پر چھائے ہوئے ہیں۔ مسجد جامی آج بھی وہی طمطراق لیے ہوئے ہے اور

جامی کے مزار پر پستے کا ایک تنہا درخت اب بھی ثابت قدمی سے کھڑا ہے۔ شاہ رُخ کی ملکہ گوہر شاد کا تعمیر کردہ کمپلیکس ہرات کے ثقافتی معراج کا نشان تھا، اِس میں یونیورسٹی بھی تھی اور عالی شان مسجد بھی۔ مؤرخ اِس کمپلیکس کو ایشیا کی سب سے زیادہ مسحور کن اور سب سے زیادہ اثر آفریں عمارت قرار دیتے تھے"۔[۴۱]

ر)۔ محمد اظہار الحق کے کالموں میں دین و مذہب کا تصور:

دین

اسلام نے مذہب کے لیے دین کا لفظ استعمال کیا ہے۔ عربی میں دین کے معنی اطاعت اور جزا کے ہیں۔ راغب اصفہانی لکھتے ہیں:

"(الطاعۃ والجزاء) دین اطاعت اور جزا کے معنی میں ہے"۔ [۴۲]

شریعت کو اس لیے دین کہا جاتا ہے کیونکہ اس کی اطاعت کی جاتی ہے۔ قرآنِ مجید میں دین مختلف معانی میں استعمال ہوا ہے۔ کبھی جزا اور حساب کے معنی میں، تو کبھی قانون و شریعت اور کبھی اطاعت اور بندگی کے معنوں میں۔ مسلمان دانشمندوں نے اسلامی تعلیمات کو بنیادی طور پر تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

۱۔ عقائد ۲۔ علم اخلاق اور ۳۔ فقہ

اسلام دینِ فطرت ہے۔ اس دین کا مستند ماخذ قرآنِ مجید اور احادیثِ صحیحہ ہیں۔ کتاب و سنت کا یہ سرچشمہ تا قیامت بالخصوص امتِ مسلمہ اور بالعموم پوری دنیا کے انسانوں کے لیے باعثِ ہدایت اور رہنمائی کا ذریعہ ہے۔

مذہب

مذہ کا لفظی مطلب راستہ یا طریقہ ہے۔ انگریزی لفظ Religion کا مادہ لاطینی لفظ Religio یعنی پابندی یا امتناع ہے۔ ویبسٹر کی انگریزی لغت میں Religion کی جو تعریف کی گئی ہے، اُس سے ملتا جلتا مفہوم مقتدرہ قومی زبان کی انگریزی اردو لغت میں بھی دیا گیا ہے جو کچھ یوں ہے،

مافوق الفطرت قوت کو اطاعت، عبادت اور عزت کے لیے بااختیار تسلیم کرنے کا عمل، متبرک اعمال یا رسوم و رواج کے سر انجام دیے جانے کا عمل، خدائے واحد یا ایک سے زیادہ دیوی دیوتاؤں پر ایمان لانے اور ان کی عبادت کا ایک مخصوص نظام۔ بالفاظِ دیگر کسی مخصوص علاقے کی مذہبی روایات کا کوئی مضبوط پسِ منظر یا وہاں کے لوگوں کا کائنات کو دیکھنے اور سمجھنے کا انداز کارفرما ہوتا ہے۔ مثلاً زراعتی معاشروں میں بارش کا دیوتا ہوتا ہے تو خانہ بدوش معاشروں میں شکار کا۔ یہ کہنا درست نہیں کہ مذہب اپنے سے متعلقہ علاقے کے لوگوں کی روحانی ضروریات کو پورا کرتا ہے بلکہ اِس کے برعکس یہ کہنا چاہیے کہ کسی خطے کے لوگ اپنے روحانی تقاضے پورے کرنے کے لیے جو پابندیاں، امتناعات، قوانین، اصول وضوابط وغیرہ خود پر عائد کرتے ہیں، اُن کا مجموعہ مذہب کہلاتا ہے۔ مذہب کی تعریف کا حتمی اور واضح تعین اتنا آسان بھی نہیں جتنا بادی النظر میں معلوم ہوتا ہے، اِس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ مذہب کوئی یک جہتی مظہر نہیں ہے۔ دنیا کے بڑے مذاہب انسانی تہذیب کا ایک جز ہیں اور اِن عظیم مذاہب کے ساتھ ساتھ ایسی چھوٹی مذہبی جماعتیں ہیں جِن کی اپنی خصوصیات ہیں اور جن کی مذہبی انفرادیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ جب ہم کسی آدمی کو مذہبی کہتے ہیں تو اِس سے ہماری مراد یہی ہوتی ہے کہ وُہ اِن احکام و اعمال پر سختی سے کاربند ہے جو اُس مذہب سے وابستہ ہیں جس میں اُس نے نشو نما پائی ہوتی ہے اور جن کو اُس نے شعوری یا غیر شعوری طور پر قبول کر لیا ہوتا ہے۔

محمد اظہار الحق چونکہ بنیادی طور پر مذہبی گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں اِس لیے مذہب سے پیار اُن کی رگ رگ میں بسا ہوا ہے، اپنے مذہب سے اِس پیار کا اظہار وُہ اپنے کالموں میں کئی جگہ کرتے نظر آتے ہیں۔ مثال کے طور پر اپنے کالم "بارہ ربیع الاوّل" میں وُہ رسولِ پاک حضرت محمد ﷺ سے محبت کا اظہار کرتے ہوئے دکھی نظر آتے ہیں کہ مسلمانوں نے اپنے آقا حضرت محمد ﷺ کی تعلیمات کو یکسر بھلا دیا ہے۔ اِس کالم میں انھوں نے مقالمہ کا انداز اپنایا ہے، جس میں ایک غیر مسلم انگریز خاتون خود محمد اظہار الحق سے مخاطب ہو کر اپنی کامیابی اور مسلمانوں کی ناکامی کا ذکر کچھ یوں کرتی ہے:

> "تمھاری دکانوں اور کارخانوں کی پیشانیوں پر کلمے اور درود لکھے ہیں اور اندر جھوٹ، ملاوٹ، وعدہ خلافی اور ٹیکس چوری کا کاروبار ہوتا ہے۔ تمھارے مکانوں پر "ھٰذا من

فضلِ ربّی" لکھا ہوتا ہے اور اندر نوکروں کو مارا پیٹا جاتا ہے، انہیں وُہ کھانا دیا جاتا ہے جو خود تم نہیں کھاتے، اور وُہ پہننے کو دیا جاتا ہے جو خود تم پہننا پسند نہیں کرتے، تمہاری گاڑیوں میں سورۂ یٰسین لٹکی ہوئی ہوتی ہے اور تم ٹریفک کے ہر قانون کی خلاف ورزی کرتے ہو۔ تم بارہ ربیع الاوّل منانے کے لیے کروڑوں خرچ کرتے ہو اور پورا سال اپنے رسول ﷺ کی تعلیمات کو پسِ پشت ڈالتے ہو۔ ہمارا ہر دن بارہ ربیع الاوّل ہے۔ ہم جو کچھ بھی ہیں اِس لیے ہیں کہ محمد ﷺ کی تعلیمات پر عمل پیرا ہیں جو اِس جہان کے لیے بھی رحمت ہیں جس میں ہم رہتے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ محمد ﷺ کا خدا ہمیں ایمان سے بھی سرفراز کرے گا۔ تم دیکھ لو! ہم میں سے جو مسلمان ہو رہے ہیں اُن میں وُہ برائیاں نہیں پائی جاتیں جن میں تم خاندانی مسلمان سرتاپا غرق ہو"۔[۴۳]

محمد اظہار الحق اپنے آقا حضرت محمد ﷺ کی شان میں جب کچھ لکھتے ہیں تو کمال لکھتے ہیں، محبت اور عشق میں خوب ڈوب کر لکھتے ہیں۔ اپنے کالم "وَرَفعنا لک ذکرک" میں وُہ بیان کرتے ہیں کہ یورپ میں کیے گئے ایک سروے کے مطابق "محمد" دنیا کا مقبول ترین نام ہے اور اِس وقت دنیا میں پندرہ کروڑ افراد کا نام محمد ہے۔ اُن کے مطابق یہ تعداد پندرہ کروڑ سے کہیں زیادہ ہے بلاشبہ یہ نام پوری دنیا پر حکمرانی کر رہا ہے۔ صدیوں سے اس نام پر کرۂ ارض کے مرد، عورتیں، بوڑھے، جوان اور بچے درودِ پاک بھیج رہے ہیں۔ کتنے درود پڑھے گئے، کتنے سلام بھیجے گئے یہ صرف اُس پروردگار ہی کو معلوم ہے جس کے علم میں ریت کے ذرے، سمندر کے قطرے، کہکشاؤں کے ستارے، درختوں کے پتے اور انسانوں کی سانسیں ہیں۔ اِس نام کی تعریف آج تک کوئی نہیں کر سکا، جس نے بھی کیا، عجز اور بے بسی کا اظہار کیا۔ غالب جیسے نکتہ سنج نے کہا تو یہ کہا:

غالب ثنائے خواجہؐ بہ یزدانِ گذاشتیم
کآن ذاتِ پاک مرتبہ دانِ محمدؐ است

کہ پروردگار خود ہی اِس نام کی تعریف کر سکتا ہے۔ کسی اور کے بس کی بات نہیں۔ محمد اظہار الحق اپنے آقا کے ساتھ ساتھ اُن کے شہر سے بھی بہت گہری محبت اور عقیدت رکھتے ہیں۔ اپنے آقا کے شہر مدینہ سے اُن کی محبت اور عقیدت کی جھلک اُن کی اِس تحریر سے بخوبی ہو سکتی ہے، جو اُنھوں نے اپنے ایک کالم شہر دلبر میں لکھی ہے، وُہ لکھتے ہیں:

"مدینۃ النبی ﷺ میں عجیب سحر ہے۔ اِس سحر کا کوئی توڑ نہیں۔ اس شہر کی ہوا سرد ہے نہ گرم، مرطوب ہے نہ خشک۔ انسان کو جو معتدل ہوا سب سے زیادہ پسند ہو سکتی ہے اور انسانی زندگی کے لیے جو ہوا سب سے زیادہ مفید ہو سکتی ہے یہی ہے کیونکہ اِسی ہوا میں خدا کے آخری رسول ﷺ کے سانس جذب ہوئے۔ اِس شہر کی مٹی آنکھوں کو سرمے سے زیادہ عزیز ہے کیونکہ اِس مٹی پر نعلینِ مبارک پڑتے تھے۔ یہی وُہ شہر ہے جس نے خدا کے رسول ﷺ کے لیے اُس وقت اپنی آغوش وا کی جب اُن کا اپنا شہر اُن کے خون کا پیاسا تھا۔ یہی شہر ہے جس کے لوگوں نے جب یہ خدشہ ظاہر کیا کہ کہیں آپ ﷺ ہمیں چھوڑ کر اپنے وطن واپس نہ چلے جائیں تو آپ ﷺ نے انھیں فرمایا تھا کہ "نہیں! تمہارا خون میرا خون ہے اور تم میرے اور میں تمھارا ہوں۔" اِسی شہر کی بچیوں نے دف بجا بجا کر طلع البدر علینا کا گیت گایا تھا۔ وُہ گیت جو آج زمانوں اور جہانوں میں گونج رہا ہے۔ اِسی شہر کے باشندوں نے اجنبی مہاجرین کو اپنا بھائی بنایا تھا۔۔۔ آج بھی اِس شہر کے رہنے والوں کے ماتھے کشادہ، چہرے چمک دار اور طبیعتیں نرم ہیں۔ خدا کے رسول ﷺ کو مہمان بنانے والے مہمان نوازی میں آج بھی آسمان سے زیادہ بلند ہیں"۔[۴۴]

محمد اظہار الحق پختہ ایمان رکھتے ہیں، مشکل سے مشکل مرحلے میں بھی اُن کا اپنے پروردگار سے یقین کم نہیں ہوتا ہے، اپنے اِس کامل یقین اور اپنے رب کی قدرت کا اظہار وُہ اپنی تحریروں میں بھی جگہ جگہ کرتے نظر آتے ہیں، اپنے کالم "واقعہ اور صاحبِ واقعہ" میں وُہ ایک لاعلاج مریض کا ذکر بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

"وُہ جو کتابِ مقدس، قرآنِ حکیم میں کہا گیا ہے کہ " سمجھ جائیں گے کہ جدائی کا وقت ہے اور کہا جائے گا کہ ہے کوئی جھاڑ پونچھ کرنے والا؟" تو اُس کی بیوی نے ڈاکٹروں اور ہسپتال کے سارے قوانین توڑ دیے اور معاملے کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور ڈاکٹروں کی سب ہدایات سے بغاوت کر کے اپنے بچوں کے باپ کو صرف تین چیزیں پلانا شروع کیں۔ اول زمزم کا پانی، دوم زیتون کا تیل اور سوم شہد۔ وُہ صبح اور شام، دن اور رات اور دن اور رات کے مختلف حصوں میں یہ تینوں چیزیں پلاتی رہی، اُس کے گرد منڈلاتی رہی اور اُس نے معاملے کو اُس اللہ کے سپرد کر دیا جو معاملے اٹھاتا ہے اور معاملے نمٹاتا ہے۔ پھر وُہ ہوا جس کی اُس کے پاس یا اُس کے ڈاکٹروں کے پاس کوئی توجیہہ نہیں تھی۔ مریض کی حالت سنبھلنا شروع ہو گئی۔ آہستہ آہستہ، لمحہ لمحہ، خاتون نے اپنے شوہر کا علاج جاری رکھا، مریض کی بینائی لوٹنے لگی، پھر کھال اگنے لگی، پھر چہرہ نارمل ہونا شروع ہوا۔ پھر من من کے ہونٹ چھوٹے ہونے شروع ہوئے اور اب جب کہ کئی مہینے گزر چکے ہیں وُہ مریض اِس حالت میں ہے کہ اپنے دفتر آتا ہے اور اپنے فرائض سر انجام دیتا ہے۔ وُہ تینوں سیال اشیاء اب بھی اُس کی روزانہ خوراک کا لازمی حصہ ہیں۔ یہ واقعہ پرانی کتابوں میں آیا ہے نہ اِس کی بنیاد نسل در نسل چلنے والی زبانی روایتیں ہیں، نہ ہی یہ کئی سو سال پہلے پیش آیا ہے۔ یہ تو اِسی زمانے کا واقعہ ہے، اِسی سال کا اور صرف چند ماہ پہلے کا"۔[۴۵]

محمد اظہار الحق حالاتِ حاضرہ پر گہری نظر رکھتے ہیں، اُنھیں فکر ہے کہ آج کا نام نہاد مسلمان اِس حد تک گر چکا ہے کہ وُہ تقریباً تمام معاشرتی برائیوں اور اخلاقی بیماریوں کا شکار ہو چکا ہے۔ وُہ رمضان کے مقدس مہینے میں بھی اپنی منافقانہ روش تبدیل نہیں کر سکتا ہے۔ محمد اظہار الحق کے کالموں کی زبان سادہ اور عام فہم سہی مگر اِس کی اثر آفرینی اور ادبی چاشنی سے انکار ممکن نہیں ہے۔ کشور ناہید نے سچ کہا تھا:

"ایک ادیب کا کالم ہی "ادب" ہوتا ہے"۔[۴۶]

ایسے ہی کالم محمد اظہار الحق کے بھی ہیں۔وُہ اپنے کالم "حدود کا تعین" میں ماہِ صیام کو مخاطب کرتے ہوئے آج کے مسلمان کا حال کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

"تم کہتے ہو کہ جھوٹ نہ بولوں۔اب اگر گاہک جو بھی قیمت تجویز کرے، میں اس کے جواب میں یہ نہ کہوں کہ یہ تو میری خرید بھی نہیں، تو تم ہی بتاؤ، سودا کیسے بکے گا۔ اگر جھوٹی گارنٹی نہ دوں تو ظاہر ہے سیل کم ہو جائے گی۔ تم کہتے ہو کہ وعدہ خلافی نہ کروں۔ لیکن تم یہ نہیں سمجھتے کہ یہ اچھی زندگی گزارنے کا بہترین فارمولا ہے۔ تم کہتے ہو ٹیکس جتنا بنتا ہے اتنا ادا کروں۔ رشوت نہ دوں۔ دُہرے دُہرے رجسٹر اور کیش بکیں نہ رکھوں، آلاتِ جراحی اور ادویات فروخت کرنے کے لیے ہسپتال کے ہر نئے ڈاکٹر کو نئی گاڑی نہ پیش کروں۔ جہازوں کے ٹکٹ بیچنے کے لیے سفارت خانوں اور سرکاری دفاتر کے عملے کو شراب کی پارٹیاں نہ دوں۔ ٹینڈر کھولنے والے اربابِ اختیار کی بیگمات کو شاپنگ نہ کراؤں، الیکشن کا ٹکٹ حاصل کرنے کے لیے پارٹی کو رشوت ڈونیشن کی صورت میں نہ دوں، ممنوعہ سامان لانے پر کسٹم والوں کو ہدیے نہ پیش کروں، جعلی پاسپورٹ نہ بنواؤں، کاریں چوری کروا کے بھتے نہ لوں، اغوا برائے تاوان کا کاروبار چھوڑ دوں، متنازعہ زمینوں پر قبضے نہ کروں، سرکاری اداروں کو غیر معیاری مال سپلائی نہ کروں، شاہراہیں تعمیر کرتے وقت اوپر حصے نہ پہنچاؤں، سرکاری عمارتوں کی تعمیر میں وہی میٹریل استعمال کروں جو کاغذات میں درج ہوتا ہے۔ پولیس اور ضلعی انتظامیہ کے گھروں کے اخراجات ادا نہ کروں تو یہ تمہارے سارے مطالبات دخل در معقولات کی تعریف میں آتے ہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ تم کہتے ہو کہ غیر مسلم ملکوں میں تمہاری ہدایات پر سارا سال عمل ہوتا ہے، تو پھر میری تجویز ہے کہ تم اپنا سالانہ پھیرا وہیں کا لگا لیا کرو۔ میں تو تمہارے لیے جو کر سکتا ہوں، کر رہا ہوں، اِس سے زیادہ کر سکتا ہوں نہ میرے بس میں ہے اور بزرگانِ

دین کو اعتراض نہیں تو تم کیوں پریشان ہوتے ہو۔ اچھا باقی باتیں پھر ہوں گی۔ آذان ہو چکی ہے۔ مسجد جانا ہے کہیں نمازِ باجماعت سے محروم نہ رہ جاؤں"۔[۴۷]

محمد اظہار الحق مسلمانوں کی عیش پرستی، بے عملی اور نا اتفاقی کو اُن کی ناکامی اور رسوائی کا سبب سمجھتے ہیں، اپنے کالم "پیر، فقیر، اوراد، وظائف" میں وُہ اِسی دکھ کو یوں بیان کرتے ہیں:

"وُہ جو اقبال نے شکوہ کیا تھا کہ برق گرتی ہے تو بے چارے مسلمانوں پر۔۔۔ تو سبب اس کا آج تک کوئی نہیں بتا پایا۔ بحثیں بہت ہوئیں، کتابیں لکھی گئیں۔ کسی نے علماء کو ذمہ دار ٹھہرایا، کسی نے حکمرانوں کو۔ کسی نے کانٹوں کا یہ ہار سیاست دانوں کے گلے میں ڈالا، کسی نے غیروں کی سازش پر تان توڑی۔ کوئی کہتا ہے کہ استعمار نے یہ حال کیا ہے، کوئی ناخواندگی کو مجرم ٹھہراتا ہے، کوئی آمریت کے ذمے لگاتا ہے۔ کوئی کہتا ہے مذہب سے دوری کا نتیجہ ہے۔ کوئی کہتا ہے مذہب کو اعصاب پر سوار کرنے سے ایسا ہوا ہے۔ جتنے منہ اتنی باتیں، جتنے معالج اتنی تشخیصیں! کوئی نہیں جس کا یقین کیا جائے"۔[۴۸]

محمد اظہار الحق اپنے کالموں میں مسلمانوں میں نمود و نمائش اور دکھلاوے پر تنقید کرتے ہیں، وُہ اِس بات پر کڑھتے نظر آتے ہیں کہ مسلمانوں نے اپنے دین کو بھی خالص نہیں چھوڑا ہے بلکہ اِس میں بھی تصنع اور بناوٹ کو شامل کر لیا ہے۔ آج کے مسلمان کا مقصدِ حیات دائمی اور اُخروی کامیابی کے بجائے محض دنیاوی دھن دولت کا حصول ہی رہ گیا ہے، اور دولتِ دنیا کے حصول میں آج کا مسلمان ہر اخلاقی اور مذہبی قدر کو کھو چکا ہے۔

اپنے کالم "بہ احترامِ فراواں" میں محمد اظہار الحق اِس المیے کو یوں بیان کرتے ہیں:

"آخری گزارش، بہ احترامِ فراواں یہ ہے کہ قوم کا سنجیدہ طبقہ، اِس سلوک سے جو الیکٹرانک میڈیا رمضان المبارک کے ساتھ کچھ عرصے سے روا رکھے ہوئے ہے، از حد پراگندہ خاطر ہے۔ اشتہارات، نیلامی، انعامات اور اِس قبیل کی دیگر سرگرمیوں کو رمضان کی مقدس شاموں اور راتوں کے ساتھ خلط ملط کر کے رکھ دیا گیا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ "اسلامی شوبزنس" باقاعدہ ایک الگ اکائی بنا دی گئی ہے۔ جو کچھ پردۂ

سیمیں پر اِس سلسلے میں دکھایا اور کہا جاتا ہے، ناظرین کی اکثریت دیکھ تو لیتی ہے مگر
دل کے نہاں خانے میں اُسے سخت ناپسند کرتی ہے۔ بہت سے لوگ سوشل میڈیا پر،
کہ وُہ اُن کی رسائی میں ہے، اِس سے کھلی بے زاری کا اظہار کر رہے ہیں۔ اِس ضمن
میں مولانا طارق جمیل نے انتہائی منطقی اور خوبصورت بات کی ہے کہ اِن پروگراموں
کا تعلق کمائی سے ہے، نہ کہ خدمتِ دین سے"۔[۴۹]

محمد اظہار الحق نے اپنے مذہب کا درد محسوس کرتے ہوئے عہدِ حاضر کے تقریباً تمام دینی اور مذہبی مسائل اور پہلوؤں پر بھرپور اظہار خیال کیا ہے اور اپنے کالموں میں مذہبی موضوعات کو نمایاں جگہ دی ہے، اِسی وجہ سے مذہبی رجحانات رکھنے والے قارئین بھی محمد اظہار الحق کے کالموں کو بہت پسند کرتے ہیں۔ عبدالحئ کے مطابق:

"جیسا کہ ایک باصلاحیت صحافی کا مقصد ہوتا ہے کہ وہ کوئی بھی خبر یا ایسی تحریر کبھی
بھی شائع نہیں کرتا جس سے کسی بھی مذہب یا خاص قوم کی دل آزاری ہو"۔ [۵۰]

محمد اظہار الحق بلاشبہ کالم نگاری کے میدان کے ایسے ہی شہسوار ہیں۔ انھوں نے نہ صرف قومی بلکہ کئی بین الاقوامی اخبارات میں بھی کالم لکھے ہیں اور جذباتی معاملات میں بھی کبھی بھی صبر کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دیا، محمد اظہار الحق اپنی پیشہ وارانہ دیانت و صداقت کی وجہ سے وہ ہر دلعزیز رہیں گے۔

حوالہ جات

۱۔https://ur.m.wikipedia.org/wiki,24 Aug.2018,9:00 a.m

۲۔https://ur.m.wikipedia.org/wiki,28 Oct.2018,10:30 a.m

۳۔https://ur.m.wikipedia.org/wiki,19 Dec.2018,11:00 a.m

۴۔جوزف آرڈوینک،ڈائنامکس آف ماس کمیونیکیشن،میک گراہل پبلیکیشن،نیویارک،۱۹۹۲ء،ص ۱۱۴

۵۔ ظفر عالم ظفری،اردو صحافت میں طنز و مزاح،فیروز سنز،لاہور،۱۹۹۶ء،ص ۳۷

۶۔ڈاکٹر مسکین علی حجازی،اداریہ نویسی،مرکزی اردو بورڈ،لاہور،۱۹۷۰ء،ص ۲۹

۷۔ محمد اظہار الحق، تلخ نوائی (کالم) "ہماری آخری امید" المیزان پبلشرز،الکریم مارکیٹ،اردو بازار لاہور،۲۰۱۶ء، ص ۱۷۴

۸۔ محمد اظہار الحق، تلخ نوائی (کالم) "زینب" المیزان پبلشرز،الکریم مارکیٹ،اردو بازار لاہور،۲۰۱۶ء، ص ۱۳

۹۔ محمد اظہار الحق ، تلخ نوائی (کالم) "افتخار عارف کہاں ہے" المیزان پبلشرز،الکریم مارکیٹ ،اردو بازار لاہور، ۲۰۱۶ء، ص ۳۵۔۳۴

۱۰۔ محمد اظہار الحق، تلخ نوائی (کالم) "افتخار عارف کہاں ہے" ایضاً، ص ۳۶۔۳۵

۱۱۔ سیّد اقبال قادری، رہبر اخبار نویسی، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی (۶)، ۲۰۰۰ء، ص ۲۷۳

۱۲۔ محمد اظہار الحق، تلخ نوائی (کالم) "فیبرک" المیزان پبلشرز،الکریم مارکیٹ،اردو بازار لاہور،۲۰۱۶ء، ص ۱۱۴۔۱۱۳

۱۳۔ احمد رضا خان بریلوی، اعلیٰ حضرت امام، کنز الایمان فی ترجمۃِ القرآن ،اتفاق پبلشرز،عزیز مارکیٹ ،اردو بازار لاہور،۱۹۹۱ء،سورۂ بقرۃ، آیت ۲۴۷

۱۴۔ راغب اصفہانی، المفردات فی القرآن، جلد اوّل، ص ۵۵۲۔۵۵۱

۱۵۔ فیومی، المصباح المنیر، ص ۲۰۰

۱۶۔ علامہ حلی، نہج الحق و کشف الصدق، ص ۵۲

۱۷۔ محمد اظہار الحق، تلخ نوائی (کالم) "پاندان کی فکر" المیزان پبلشرز، الکریم مارکیٹ، اردو بازار لاہور، ۲۰۱۶ء، ص ۲۴۔۲۳

۱۸۔ محمد اظہار الحق، تلخ نوائی (کالم) "دربارِ وطن میں جب ایک دن" المیزان پبلشرز، الکریم مارکیٹ، اردو بازار لاہور، ۲۰۱۶ء، ص ۱۹۲

۱۹۔ محمد اظہار الحق، تلخ نوائی (کالم) "انگریز کے اصل ذہنی غلام" المیزان پبلشرز، الکریم مارکیٹ، اردو بازار لاہور، ۲۰۱۶ء، ص ۱۸۲

۲۰۔ محمد اظہار الحق، تلخ نوائی (کالم) "کاش! درمیان میں دیوار ہوتی" المیزان پبلشرز، الکریم مارکیٹ، اردو بازار لاہور، ۲۰۱۶ء، ص ۱۴۹۔۱۴۷

۲۱۔ محمد اظہار الحق، تلخ نوائی (کالم) "نندی پور! اے نندی پور" المیزان پبلشرز، الکریم مارکیٹ، اردو بازار لاہور، ۲۰۱۶ء، ص ۱۰۷۔۱۰۶

۲۲۔ عابد صدیقی، ادب اور صحافت، نیرنگ اکیڈمی، حیدر آباد، ۱۹۷۴ء، ص ۷۵

۲۳۔ محمد اظہار الحق، تلخ نوائی (کالم) "وہ جو دودھ سے بھری بالٹیاں گھروں کو لے گئے" المیزان پبلشرز، الکریم مارکیٹ، اردو بازار لاہور، ۲۰۱۶ء، ص ۹۱۔۹۰

۲۴۔ محمد اظہار الحق، تلخ نوائی (کالم) "شیر اور سرگوشی" المیزان پبلشرز، الکریم مارکیٹ، اردو بازار لاہور، ۲۰۱۶ء، ص ۷۶

۲۵۔ محمد اظہار الحق، تلخ نوائی (کالم) "دو تصویریں" المیزان پبلشرز، الکریم مارکیٹ، اردو بازار لاہور، ۲۰۱۶ء، ص ۶۰۔۵۹

۲۶۔ ڈاکٹر آفتاب اصغر، مقدمہ تاریخ مبارک شاہی

۲۷۔ پروفیسر عمر زبیری، قدیم تہذیبیں اور مذاہب، طیب شمشاد پرنٹرز، لاہور، ۲۰۱۲ء، ص ۳۰

۲۸۔ پروفیسر عمر زبیری، قدیم تہذیبیں اور مذاہب، ایضاً، ص ۱۹

۲۹۔ محمد اظہار الحق، تلخ نوائی (کالم) "مہاتیر محمد" المیزان پبلشرز، الکریم مارکیٹ، اردو بازار لاہور، ۲۰۱۶ء، ص ۲۴۹۔۲۴۷

۳۰۔ محمد اظہار الحق، تلخ نوائی (کالم) "بلوچستان۔ اندھوں کے نرغے میں ہاتھی" المیزان پبلشرز، الکریم مارکیٹ، اردو بازار لاہور، ۲۰۱۶ء، ص ۱۳۰۔۱۲۹

۳۱۔ عبدالحئی، اردو صحافت اور سر سیّد احمد خان، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی (۶)، ۲۰۰۸ء، ص ۱۱۳

۳۲۔ محمد اظہار الحق، تلخ نوائی (کالم) "شاہراہ اور پگڈنڈیاں" المیزان پبلشرز، الکریم مارکیٹ، اردو بازار لاہور، ۲۰۱۶ء، ص ۸۴۔۸۳

۳۳۔ محمد اظہار الحق، تلخ نوائی (کالم) "اسلم" المیزان پبلشرز، الکریم مارکیٹ، اردو بازار لاہور، ۲۰۱۶ء، ص ۹۷

۳۴۔ محمد اظہار الحق، تلخ نوائی (کالم) "جزیرہ اور املی کے بیج" المیزان پبلشرز، الکریم مارکیٹ، اردو بازار لاہور، ۲۰۱۶ء، ص ۶۸۔۶۷

۳۵۔ عبدالحئی، اردو صحافت اور سر سیّد احمد خان، ایضاً، ص ۱۱۰

۳۶۔ محمد اظہار الحق، تلخ نوائی (کالم) "ڈھاکہ! ہم شرمندہ ہیں" المیزان پبلشرز، الکریم مارکیٹ، اردو بازار لاہور، ۲۰۱۶ء، ص ۱۹۴

۳۷۔ محمد اظہار الحق، تلخ نوائی (کالم) "سقوطِ ڈھاکہ" المیزان پبلشرز، الکریم مارکیٹ، اردو بازار لاہور، ۲۰۱۶ء، ص ۱۶۸

۳۸۔ امداد صابری، تاریخ صحافت اردو (جلد اوّل)، جدید پرنٹنگ پریس، دہلی، ۱۹۶۲ء، ص ۲۰

۳۹۔ محمد اظہار الحق، تلخ نوائی (کالم) "تاشقند سے خوارزم اور ترمذ تک" المیزان پبلشرز، الکریم مارکیٹ، اردو بازار لاہور، ۲۰۱۶ء، ص ۲۵۶۔۲۵۵

۴۰۔ امداد صابری، تاریخ صحافت اردو (جلد اوّل)، ایضاً، ص ۲۰

۴۱۔ محمد اظہار الحق، تلخ نوائی (کالم) "ہرات" المیزان پبلشرز، الکریم مارکیٹ، اردو بازار لاہور، ۲۰۱۶ء، ص ۲۶۹

۴۲۔ راغب اصفہانی، المفردات فی القرآن، جلد اوّل، ۱۲

۴۳۔ محمد اظہار الحق، تلخ نوائی (کالم) "بارہ ربیع الاوّل" المیزان پبلشرز، الکریم مارکیٹ، اردو بازار لاہور، ۲۰۱۶ء، ص ۱۷۹

۴۴۔ محمد اظہار الحق، تلخ نوائی (کالم) "شہر دلبر (۲)" المیزان پبلشرز، الکریم مارکیٹ، اردو بازار لاہور، ۲۰۱۶ء، ص ۲۸۰۔۲۷۹

۴۵۔ محمد اظہار الحق، تلخ نوائی (کالم) "واقعہ اور صاحبِ واقعہ" المیزان پبلشرز، الکریم مارکیٹ، اردو بازار لاہور، ۲۰۱۶ء، ص ۲۳۴۔۲۳۳

۴۶۔ کشور ناہید، جواب سوالنامہ مقالہ نگار (نثار احمد)، ڈاکٹر وحید قریشی بطور کالم نگار، دریافت شمارہ ۱۵، نمل یونیورسٹی اسلام آباد، ۲۰۱۶ء، ص ۳۱۴

۴۷۔ محمد اظہار الحق، تلخ نوائی (کالم) "حدود کا تعین" المیزان پبلشرز، الکریم مارکیٹ، اردو بازار لاہور، ۲۰۱۶ء، ص ۲۸۔۲۷

۴۸۔ محمد اظہار الحق، تلخ نوائی (کالم) "پیر، فقیر، اوراد، وظائف" المیزان پبلشرز، الکریم مارکیٹ، اردو بازار لاہور، ۲۰۱۶ء، ص ۳۸

۴۹۔ محمد اظہار الحق، تلخ نوائی (کالم) "بہ احترامِ فراواں" المیزان پبلشرز، الکریم مارکیٹ، اردو بازار لاہور، ۲۰۱۶ء، ص ۴۷

۵۰۔ عبدالحئی، اردو صحافت اور سر سیّد احمد خان، ایضاً، ص ۱۰۵

باب سوم

محمد اظہار الحق کی کالم نگاری کی سماجی ،ثقافتی اور معاشی جہات کا تنقیدی مطالعہ

الف)۔ محمد اظہار الحق کے کالموں میں تہذیبی، سماجی اور ثقافتی رجحانات:

تہذیب

تہذیب یا(Civilization) ایک ایسا سلسلہ یا ورثہ ہے جس میں سماج یا کوئی تہذیبی گروہ جو کسی مقام پر کاشت کرتے ہوئے مقیم ہوتا ہے اور اپنی زندگی گزارتا ہے اور اِس گزارنے والی زندگی میں وہ تمام شعبہ جات شامل ہیں جو سماج میں عمومی طور سے پائے جاتے ہیں۔ تاریخ دانوں کے خیال کے مطابق تہذیب اور تمدن کی نشو نما اُن وادیوں میں ہوئی جن میں پانی کی فراوانی تھی اور جہاں کی مٹی زرخیز تھی۔ سامری، بابلی، آشوری، کلدانی اور آریائی تہذیبیں دنیا کی قدیم ترین تہذیبیں ہیں۔ تاریخ کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ انسان نے ہمیشہ مشکلات پر قابو پانے کی کوشش کی اور جیسے جیسے وہ مشکلات پر حاوی ہوتا چلا گیا وہ ترقی یافتہ اور متمدن ہوتا چلا گیا۔ بقول پروفیسر ٹائن بی:

> "انسان کے متمدن ہونے کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وُہ دوسری مخلوقات سے بہتر تھا بلکہ انتہائی مشکلات میں گھر کر انسان نے اُن مشکلات کا مقابلہ جس بہادری اور ہمت سے کیا اُس ہمت و پامردی نے انسان کو متمدن بنا دیا"۔[1]

تہذیب و تمدن کی ترقی کے معنی یہ ہیں کہ انسان آہستہ آہستہ تہذیب یافتہ بنتا چلا گیا، اُس نے قدرتی وسائل کو اپنے ہاتھوں میں لے کر زندگی کو آسان اور بتدریج بہتر سے بہترین کر دیا ساتھ ساتھ زندگی میں نظم و نسق قائم کیا۔ اصولوں، روایات اور قانون کا احترام سیکھا اور معاشرہ میں جان و مال کی حفاظت کی ذمہ داری بخوبی نبھائی۔

انسان جب بربریت اور جہالت کے دور میں تھا تو اُس میں اور جانوروں میں کوئی فرق نہیں تھا لیکن انسانی دماغ میں ترقی کی حیرت انگیز صلاحیت رکھی گئی تھی اور اِسے سوچنے اور سمجھنے کی قوت عطا کی گئی تھی۔ انسان نے جنگلی زندگی اور خونخوار جانوروں کے مقابلے میں اپنے دماغ کو استعمال کیا، پتھر کو ہتھیار کے طور پر استعمال کیا نیز اِس سے آگ کی چنگاری پیدا کی، جنگلی جانور اُس سے خوف زدہ ہو گئے اور یوں انسان جانوروں سے برتر ہوتا چلا گیا۔ اسی طرح انسان کے اندر ملکیت کا احساس پیدا ہوا، وہ عورت اور اولاد کو "اپنا" سمجھنے لگا اور ان کی حفاظت کی ذمہ داری سنبھالی، اِس طرح خاندان کی ابتدا ہوئی۔ خاندان سے قبیلہ، قبیلوں سے علاقہ، علاقوں سے ملک اور ملکوں سے برِّاعظم وجود میں آتے چلے گئے اور انسان مہذب اور متمدن ہوتا چلا گیا۔

سماجیات

عام فہم انداز میں تو تمام انسانوں کا مجموعہ سماج کہلاتا ہے لیکن اگر کوئی یہ سوال اٹھانا شروع کر دے کہ انسان کیا ہے؟ تو پھر انسان اور سماج دونوں کے وجود پر سوال اُٹھنا شروع ہو جاتے ہیں اور دونوں ہی پیچیدہ تر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ انسان صرف گوشت پوست کا لوتھڑا تو نہیں ہے بلکہ یہ ایک ایسا صاحبِ شعور اور صاحبِ نطق جانور ہے جو صرف ایک وجود کا نام نہیں ہے بلکہ اِس وجود کی بقا کے لیے درکار تمام مادی، جغرافیائی اور ماحولیاتی نظام کا نام بھی ہے۔ اِس تعریف کے مطابق کوئی بھی انسان اُس وقت تک مکمل انسان کہلا ہی نہیں سکتا جب تک اُسے اپنی بقا کے لیے تمام معیاری اور مناسب ماحول حاصل نہیں ہو جاتا۔ گروہ اور اجتماع اپنی سادہ شکل سے پیچیدہ شکل کی طرف سفر کرتے رہے ہیں اِس لیے یہ "مناسب" اور "معیاری" تقابلی صفات بھی ہوتی چلی گئیں۔ لوگوں کے تمام گروہ اور اجتماع کے ارتقائی مراحل سے گزرنے کے عمل کے دوران اور سماج کی موجودہ شکل تک سفر کے مراحل طے کرتے ہوئے یہ دونوں اصطلاحات اچھی خاصی "سیاسی" اصطلاحات بن گئی ہیں۔ سماجی علوم کے ایک معروف انگریزی جریدے کے مطابق:

> "سماجی علوم کا اولین مقصد یہ ہے کہ جو ان لوگ وہ صلاحیت پیدا کریں جس سے وہ معلومات اور وجوہ کے ساتھ عوامی مفاد کے فیصلے لے سکیں جیسا کہ ثقافتی اختلافات

اور جمہوری سماج کی باہمی طور پر منحصر دنیا کے شہریوں کے طور پر انہیں لینا چاہیے"۔

[۲]

سماجیات کے لیے انگریزی میں لفظ (Sociology) مستعمل ہے، جس کی اصل لاطینی اور یونانی ہے۔لاطینی لفظ "Socius" بہ معنی ساتھی، سنگتی اور یونانی لفظ "Logos" بہ معنی علم یا سخن یا بحث کے ہیں۔ سوشیالوجی کی اصطلاح کا سب سے پہلے فرانسیسی انشائیہ نگار عمانوئیل جوزف سیئیس (۱۸۳۶-۱۷۴۸) نے اپنے ایک غیر مطبوعہ قلمی نسخے میں استعمال کیا۔ بعد ازاں فرانسیسی سائنسی فلسفی آگستے کومتے (۱۸۵۷-۱۷۹۸) نے ۱۸۳۸ء میں آزادانہ طور پر اِس کی تعریف وضع کی۔ فریڈرک کوپلسٹن کے بقول:

"کومتے نے عمرانیات کی ترقی کو ایک طاقت ور امنگ بخشی، ایک ایسی امنگ جو انیسویں صدی کے آخری عشروں میں ثمر بار ہوئی"۔ [۳]

سوشیالوجی کا متبادل لفظ عمرانیات عربی کے لفظ عمران سے نکلا ہے، جس کے معنی ہیں۔ آبادی، سماج، رہن سہن۔

اردو دائرہ معارف اسلامیہ، وکی پیڈیا کے مطابق:

"سماج کے لیے عمران کا لفظ سب سے پہلے ابنِ خلدون نے استعمال کیا تھا"۔ [۴]

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ چودھویں صدی عیسوی میں شمالی افریقی مسلمان دانشور ابنِ خلدون، علمِ عمرانیات کا باوا آدم ہے، اُس کی کتاب "مقدمہ ابنِ خلدون" سماجی ہم آہنگی اور سماجی تصادم کے بارے میں سماجی سائنسی استدلال سے کام لینے میں پہلا بڑا سنگِ میل ہے۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، وکی پیڈیا کے مطابق:

"اردو میں عمرانیات کی اصطلاح سب سے پہلے ۱۹۳۵ء میں علم الاخلاق میں ملتی ہے"۔ [۵]

ثقافت

ثقافت عربی زبان کے لفظ ثقف سے نکلا ہے۔ثقف کے معنی عقلمندی اور مہارت کے ہیں، اِس کا متبادل انگریزی زبان کا لفظ (Culture) ہے۔ اِس کا مطلب کسی چیز یا ذات کی ذہنی یا جسمانی نشو نما ہے۔ ثقافت سے

مراد کسی قوم یا طبقے کی تہذیب ہے۔ علماء نے اِس کی تعریف یوں بھی کی ہے۔ ثقافت اکتسابی یا ارادی یا شعوری طرزِ عمل کا نام ہے۔ اکتسابی طرزِ عمل میں ہماری وُہ تمام عادات، افعال، خیالات اور رسوم و اقدار شامل ہیں جن کو ہم ایک منظم معاشرے یا خاندان کے رکن کی حیثیت سے عزیز رکھتے ہیں یا اُن پر عمل کرتے ہیں یا اُن پر عمل کرنے کی خواہش رکھتے ہیں تاہم ثقافت یا کلچر کی کوئی جامع تعریف آج تک نہیں ہو سکی۔ ثقافت انسان کا اظہار ہے اور قوموں کی پہچان ثقافت ہی سے ہے۔ ہر قوم کی الگ ثقافت ہوتی ہے۔ ماہرینِ سماجیات نے ثقافت کی مختلف تعریفیں کی ہیں، جن میں سے چند حسب ذیل ہیں۔ گسٹوف کلائم ثقافت کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے کہ

رسوم وروایات، امن وجنگ کے زمانے میں انفرادی اور اجتماعی رویے دوسروں سے اکتساب کیے ہوئے طریقہ ہائے کار، سائنس، مذہب اور فنون کا وُہ مجموعہ ثقافت کہلاتا ہے جو نہ صرف ماضی کا ورثہ ہے بلکہ مستقبل کے لیے تجربہ بھی ہے۔ ای۔ بی۔ ٹیلر ثقافت کی تعریف اس طرح کرتا ہے:

> "ثقافت سے مراد وہ علم، فن، اخلاقیات، قانون، رسوم ورواج، عادات، خصلتیں اور صلاحیتوں کا مجموعہ ہے جو کوئی اس حیثیت سے حاصل کر سکتا ہے کہ وہ معاشرے کا ایک رکن ہے"۔ [۲]

اسی طرح ثقافت کی تعریف میں رابرٹ ایڈ فلیڈر رقم طراز ہے۔ ثقافت انسانی گروہ کے علوم اور خود ساختہ فنون کا ایک ایسا متوازن نظام ہے جو باقاعدگی سے کسی معاشرہ میں جاری وساری ہے۔ اردو کالم نگاری میں تقریباً ہر کالم نگار نے بالعموم اور بعض کالم نگاروں نے بالخصوص سماجی اور ثقافتی موضوعات کو اپنی کالم نگاری کا حصہ بنایا، انھی میں سے ایک نام محمد اظہار الحق کا بھی ہے۔ اُن کے اردو کالم ایک اعتبار سے خبروں کی تقویت رسانی کا وسیلہ بھی ہیں اور جو بات خبروں سے کسی حد تک سامنے آتی ہے، اُن کے کالم اسے مزید اجاگر بھی کرتے ہیں۔ محمد اظہار الحق اپنے کالموں میں خبر کے مختلف پہلوؤں پر تبصرہ اور تجزیہ پیش کرتے ہیں اور اکثر مختلف معاشرتی مسائل کے حل کی ضرورت پر زور دیتے ہیں، وُہ اِن مسائل کے ممکنہ حل سے متعلق تجاویز بھی پیش کرتے ہیں اور یوں ایسی فضا اور ماحول کی تشکیل میں معاون ثابت ہوتے ہیں جس میں عوام کے سماجی مسائل

اور مشکلات اور ان کے سماجی و ثقافتی رویوں کی تصویر نہ صرف واضح ہو کر سامنے آتی ہے بلکہ اُن کے حل کی راہیں بھی روشن ہو جاتی ہیں۔ اپنے ایک کالم "پانچ بیماریاں" میں محمد اظہار الحق ایک ایسے غیر ملکی سفیر، قوموں کے عروج و زوال کا مطالعہ جس کا مشغلہ تھا، اُس کی زبانی وطنِ عزیز کا احوال کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

"میں یہاں آنے سے پہلے بہت سے ملکوں میں رہا، مسلمان ملکوں میں بھی، مغربی ملکوں میں بھی اور مشرقِ بعید کے ملکوں میں بھی۔ میری سوچی سمجھی "رائے "تمہارے ملک کے بارے میں یہ ہے کہ یہاں بے پناہ ٹیلنٹ ہے، ترقی کے لامحدود امکانات ہیں لیکن تمہارے قومی جسم کو چند بیماریاں لاحق ہیں اور یہ بیماریاں ٹیلنٹ کو کچھ بھی نہیں کرنے دیتیں۔ پہلی بیماری تم لوگوں کی انتہا درجے کی جذباتیت ہے، جو تمہیں سوچنے سمجھنے سے، تجزیہ کرنے سے اور دعویٰ کا ثبوت طلب کرنے سے روکتی ہے۔ اس کی وجہ تعلیم کا نہ ہونا ہے یا ایک تاریخی روایت کا تسلسل؟۔۔۔ تم لوگوں کو لاحق دوسری خطرناک بیماری یہ ہے کہ تم قانون کا فیصلہ نہیں کرنے دیتے اور خود فیصلہ کرتے ہو، یوں ہر شخص کا فیصلہ مختلف ہوتا ہے۔۔۔ تمہاری تیسری بیماری یہ ہے کہ تم لوگ دوسرے سے رابطہ صرف اُس وقت کرتے ہو جب تمہارا اپنا کام ہوتا ہے لیکن جب تمہارے ذمے دوسرے کا کام ہو تو تم رابطہ نہیں کرتے۔ دنیا میں جتنی بھی ترقی یافتہ قومیں ہیں، وہ اِس بے حد خطرناک بیماری سے پاک صاف ہیں۔۔۔

چوتھی خطرناک بیماری یہ ہے کہ تمہاری اکثریت مذہب کو ذاتی اصلاح کے بجائے مالی فائدے کے لیے استعمال کر رہی ہے اور تم لوگوں کو اِس کا احساس تک نہیں حالانکہ اسلام کا اولین مقصد فرد کی اصلاح ہے۔۔۔ تمہاری پانچویں بیماری یہ ہے کہ افریقی ممالک کو چھوڑ کر تم شاید دنیا میں سب سے زیادہ گندے ہو۔ خاص طور پر جتنے گندے تمہاری مسجدوں کے طہارت خانے ہیں، اُتنا گند میں نے کسی اور مسلمان ملک میں نہیں دیکھا"۔[۷]

محمد اظہار الحق وطنِ عزیز کے موجودہ حکمرانوں سے مایوس ہو چکے ہیں، وُہ اپنے کالموں میں مسلسل یہی دُکھ بیان کرتے ہیں کہ ہمارے اربابِ اختیار نے کبھی اپنی عوام کے لیے کچھ نہ سوچا اور عملی طور پر غریب عوام کے لیے بس جھوٹے وعدے اور مکر و فریب ہی سے کام لیا۔ محمد اظہار الحق اپنے کالم "پہلا سورج" میں اپنے اِسی دکھ کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"کسی نئے سال کا سورج ہمارے دکھوں کا مداوا نہ کر سکا۔ کوئی نیا سال ہمارے لیے عزت نہ لایا۔ ہم اپنے ہی ملک میں ہمیشہ تیسرے درجے کے شہری رہے۔ ہمارے گاؤں گرد میں چھپے ہی رہے۔ ہسپتال بنے نہ سکول، سڑکیں ٹوٹی ہی رہیں۔ ہمارے قصبے پتھر کے زمانوں سے باہر نہ نکل سکے۔ ہر نیا سال وہی آپشن لایا جو گزرے ہوئے برس لاتے رہے۔ آپشن۔۔۔ اختیار۔ ہاں تمہیں اختیار ہے۔ تم آزاد ہو، بلاول کو چُن لو یا مونس الٰہی کو یا حمزہ شہباز کو۔۔۔ ہمارے پیچھے جنگل ہے۔ درختوں پر مچانیں باندھے، تیر انداز بیٹھے ہیں۔ سامنے سمندر میں گھڑیال ہیں۔ یہی آپشن ہیں۔ یہی اختیار ہے۔ یہی آزادی ہے۔ اُن سیاست دانوں کو چُن لیں جن کے ہاتھوں میں تیر ہیں یا اُنھیں منتخب کر لیں جو گھڑیالوں جیسے جبڑے کھولے ساحلوں پر لیٹے ہیں۔ ہمیں کوئی ایسا لیڈر نہ مل سکا جو ہمارے جیسے گھروں میں، ہمارے گلی محلوں میں رہتا ہو۔۔۔ جو دکان سے چینی، گھی اور پتی خود خریدتا ہو"۔[۸]

محمد اظہار الحق اپنے کالموں میں یہ کرب اکثر بیان کرتے ہیں کہ موجودہ عہد سائنس اور ترقی کا دور ہے، دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے، مگر ہماری بدقسمت عوام تک ترقی کے ثمرات پتہ نہیں کب تک پہنچیں گے، اسی المیے کو اپنے ایک اور کالم "نیا سال" میں وہ کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

"سال کی آخری شام تھی۔ ہم نے اپنے خواب تھیلے میں ڈالے، تھیلا چارپائی کے پائے سے لٹکایا، لحاف اوڑھا اور سو گئے۔ صبح اٹھے تو تھیلا خالی تھا۔ ہمارے نئے سال کے خواب چوری ہو گئے تھے۔۔۔ ہم ۶۵ سال سے یکم جنوری دیکھ رہے ہیں۔ ہم ہر یکم جنوری کو اٹھتے ہی تھیلا چارپائی کے پائے سے اتارتے ہیں اور ٹٹولتے ہیں لیکن تھیلا جو

دسمبر کی آخری شام خوابوں سے بھرا ہوتا ہے، ہر یکم جنوری کو خالی ملتا ہے! اِن ۶۵ سالوں میں دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔۔۔ مگر اِن پینسٹھ سال میں ہم جہاں تھے وہیں رہے، جیسے تھے ویسے ہی رہے۔۔۔ کسی یکم جنوری نے ہمیں قانون کی مساوات نہیں دی۔ ہر یکم جنوری نے ہمیں نئے فریب دیے۔ ہر نیا سال ہمارے لیے نئے شعبدے اور نئے دھوکے لایا۔۔۔ ہم ہر دسمبر کی آخری شام خواب سرہانے رکھ کر سوتے ہیں اور ہر جنوری کی نئی صبح ہمیں ہمارے خوابوں کے تھیلے خالی ملتے ہیں اور کچھ نہیں تو ہمارے خواب ہی ہمیں واپس کر دو"۔[۹]

درج بالا دونوں کالموں سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ سیاست کا براہِ راست اثر سماج پر پڑتا ہے اور سماجی حالات کی تبدیلی کافی حد تک سیاسی اثرات اور سیاسی عوامل کے تابع ہوتی ہے۔ سماجی مسائل کی جڑیں سیاسی ناانصافیوں اور ناہمواریوں میں ہوتی ہیں اور سیاست کے بدلتے رُخ عوام کے رویوں اور اُن کی روزمرہ زندگی پر کافی حد تک اثر انداز ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ کے ہر عہد میں، ہر حکمران نے اپنی سیاسی حکمتِ عملی کے اثرات کا جائزہ لینے کے لیے اپنی عوام کے سیاسی حالات سے آگاہی کو ضروری سمجھا جیسا کہ مغلوں کے دورِ حکومت میں اخبارات میں خبروں کے تنوع اور اُن میں سماجی خبروں کی اہمیت کے حوالے سے صحافت کے معروف محقق ڈاکٹر عبدالسلام خورشید لکھتے ہیں:

"مغل دور کے اخبارات میں شاہی فوجی مہمات کی اطلاعات کے علاوہ سیاسی، معاشرتی، تجارتی، زرعی اور معاشی خبریں درج ہوتی تھیں۔ اخبارات عوام کے لیے اس لحاظ سے بے حد مفید رہتے تھے کہ سلطنت کے طول و عرض میں ناانصافی، بدنظمی، رشوت ستانی اور حاکموں، امیروں اور سرداروں کی ظالمانہ حرکتوں کی ساری اطلاعات بادشاہ کے گوش گزار ہو جاتیں اور وُہ فوراً اُن کی روک تھام میں مصروف ہو جاتا۔ اِس طرح اخباری تنظیم عوامی شکایات کے دور کرانے میں مدد دیتی تھی، جو آج بھی مطبوعہ صحافت کا ایک اہم فریضہ ہے"۔[۱۰]

محمد اظہار الحق گاہے بگاہے بیرونِ ملک بھی جاتے رہتے ہیں، جیسا کہ وُہ اکثر اپنے پوتوں سے ملنے آسٹریلیا جاتے ہیں۔اُن کو ایک بار آسٹریلیا کی مشہور تعلیمی درسگاہ "پرتھ یونیورسٹی" میں ایک سیمینار میں شریک ہونے کا موقع بھی ملا تو وہ اُس یونیورسٹی کے مشاہدات کو اپنے الفاظ میں کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

"لیکن جب میں نے یونیورسٹی آف پرتھ کا موازنہ اپنے ملک کی یونیورسٹی سے کیا تو ایک کھرا اور سچا پاکستانی ہونے کے ناطے سے میں اِس یونیورسٹی سے بالکل بھی متاثر نہیں ہوا۔مجھے پرتھ کے طلبہ پر رحم آیا۔یہ بے چارے اتنے پسے ہوئے ہیں کہ جلوس نکال کر امتحان کی تاریخ تک نہیں بدلوا سکتے۔آپ آسٹریلیا کی اِس دوسری بڑی یونیورسٹی کی بے بسی کا اندازہ لگائیے کہ داخلے کی تاریخ، انٹرویو کی تاریخ، امتحان کا دن، نتیجے کا اعلان، سب کچھ مقرر ہے اور ملک کا وزیرِ اعظم بھی ایک دن کی تاخیر و تقدیم نہیں کر سکتا! یونیورسٹی کی ایک اور بدقسمتی یہ ہے کہ کسی سیاسی یا مذہبی پارٹی کا سٹوڈنٹ ونگ یہاں موجود نہیں! کتاب میلے کے پردے میں یونیورسٹی پر کسی گروپ کا قبضہ نہیں۔ آج تک کسی پروفیسر پر حملہ نہیں ہوا اور نہ کسی وائس چانسلر کے دفتر کا گھیراؤ کیا گیا۔کسی سیاسی جماعت کے کارکن طلبہ کا روپ دھار کر کسی ہوسٹل پر قابض نہیں اور نہ ہوسٹلوں کے وارڈن طلبہ کے ہاتھوں میں یرغمال بنے ہوئے ہیں۔کوئی جلوس ہے نہ ہڑتال، نعرے ہیں نہ کلاسوں کا بائیکاٹ، نئے طلبہ آتے ہیں تو "رہنمائی" کے پردے میں کوئی انھیں قابو کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔آپ اِس یونیورسٹی کی بدقسمتی کا اندازہ لگائیے کہ آج تک اسے کسی جرنیل وائس چانسلر کے نیچے زندگی گزارنے کا اعزاز حاصل نہیں ہوا۔ آج تک کوئی ایسا واقعہ نہیں ہوا کہ پولیس کو کیمپس کے کسی حصے یا کسی ہوسٹل کا محاصرہ کرنا پڑے۔کسی سیاسی جماعت میں یہ ہمت نہیں کہ وہ اپنے حامیوں کو بھرتی کروائے یا مخالف لیکچراروں کو قتل کروا دے"۔"

ہم دیکھتے ہیں کہ درج بالا کالم میں محمد اظہار الحق نے طنز کے نشتر چلا کر، بڑی خوبصورتی کے ساتھ اپنے اور بیرونی ممالک کے اعلیٰ تعلیمی اداروں کا موازنہ کیا ہے اور اپنے ہاں کی یونیورسٹیوں کی زبوں حالی کا المیہ بیان کیا ہے۔ محمد اظہار الحق بلاشبہ حساس دل اور گہری نظر رکھتے ہیں چونکہ انھیں دنیا کے کئی ممالک میں جانے کا اتفاق ہوا ہے اِس لیے انھوں نے وہاں کی خوراک، رسوم و رواج اور تہذیب و ثقافت کے بارے میں دلچسپ مشاہدات کیے اور اُن کے بارے میں اپنے تاثرات خوبصورتی اور مہارت کے ساتھ بیان کیے ہیں۔ اپنے کالم "مگر اک بات، جو دل میں تھی، جس کا غم بہت ہے" میں وہ اپنے بیرونِ ملک کے تجربات کو کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

> ""منیلا" میں اناس اور ناریل کے دودھ سے بنی ایسی سویٹ ڈش پیش کی گئی کہ پرستان میں بھی نہ ہو گی۔ "کوالالمپور" میں تربوز کا رس پہلی بار پیا۔ "ترمذ" اور "خیوا" کے قدیم شاہی محلات میں صدر کریموف نے دعوتیں کیں جو گھنٹوں پر محیط تھیں۔ اُزبک پلاؤ اور ساتھ وسط ایشیائی رقص! سرما تھا جب تاشقند میں خربوزہ کھایا۔ اتنا شیریں کہ سکتہ طاری ہو گیا۔ میزبانوں نے معذرت کی کہ سرما میں ہمارے میوے پھیکے رہ جاتے ہیں۔ "قونیہ" اور "استنبول" میں گوسفند کا گوشت اور چھاچھ، جو ترکوں کا قومی مشروب ہے، اپنی مثال آپ ہے۔ "اردن" میں بحر مردار کے کنارے لبنانی کھانا کھایا۔ سٹارٹر ہی بیسیوں تھے۔ "عرب" چاول پکاتے ہیں تو چلغوزوں کی دبیز تہہ میں چھپا ہی دیتے ہیں۔ "فاس" (کاسابلانکا) اور "رباط" میں " تاجین " اور "قوس قوس" مراکشی ڈشیں جو پوری دنیا میں معروف ہیں ، کھائیں۔۔۔ "برٹش کولمبیا" کے دارالحکومت "وینکوور" سے ساٹھ ستر میل دور" وکٹوریہ" ہے جو جزیرہ ہے۔ یہاں مصالحہ، چائے اور انڈین ڈشیں لاجواب ملیں۔ "بیجنگ" میں اہلِ کاشغر کا پکایا ہوا سالم بکرا جو پکنے کے بعد اپنی ٹانگوں پر کھڑا تھا کسی اور دنیا کا لگتا تھا۔ غرض "مانٹریال" اور "نیویارک" سے لے کر "میکسیکو" تک "بارسلونا" سے لے کر "قرطبہ" اور "غرناطہ" تک " ایڈنبرا" سے لے کر" برسلز" تک۔ یہاں تک کہ "صومالیہ" کے دارالحکومت "موغادیشو" تک انواع و اقسام کے کیا ماکولات اور کیا مشروبات، قسّامِ ازل نے مقدر میں لکھے"۔[۲]

کسی بھی سماج میں خوراک ثقافت کا خوبصورت اور جامع مظہر ہوتی ہے۔ محمد اظہار الحق نے مشہور غیر ملکی خوراکوں کے بعد اپنے ملک کے روایتی دیہی کھانوں کا ذکر بڑی خوبصورتی اور کمال مہارت سے کیا ہے۔ اُن کی تحریریں اپنے اندر ایسی ہی دلکشی اور انفرادیت کا ایک جہان لیے ہوئے ہوتی ہیں، جو قاری کو اپنے سحر میں جکڑ لیتی ہیں۔ اپنے کالم "مگر اک بات، جو دل میں تھی، جس کا غم بہت ہے" میں وہ بیان کرتے ہیں کہ مجھے دنیا بھر کے لذیذ کھانے چکھنے کا اتفاق ہوا ہے، بیرونی ملکوں کے بہترین اور خوش ذائقہ کھانے اپنی جگہ لیکن اپنے ہاں کے روایتی دیسی اور خالص کھانوں کی بات ہی الگ ہے، وہ کہتے ہیں:

"رات کی روٹی کے اُس چوتھائی حصّے کا مزا آج تک نہیں بھولتا جو دادی جان رات کو دُودھ والی چاٹی میں ڈالتی تھیں اور صبح دہی کے ساتھ ملتا تھا۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد اَدھ رڑکا اور میٹھی لسی مٹی کے پیالوں میں! تنور سے اُتری ہوئی روٹی میں انگلیوں سے کیے گئے گڑھے جن میں مکھن رچ بس جاتا تھا اور شکر اور گھی سے بھرے ہوئے پیالے! مکھڈی حلوے سے بھرے ہوئے طباق جن پر چاندی کے ورق لگتے تھے۔ پھر جس دن "گاہ" ہوتا تھا یعنی گندم کے گٹھوں سے بھوسہ اور دانے الگ کیے جاتے تھے، تو خندق کھودی جاتی تھی جسے "چر" کہا جاتا تھا۔ اِس میں آگ جلتی تھی۔ اوپر درجنوں مٹی کے بڑے بڑے کٹورے ہوتے تھے۔ گوشت اپنی ہی چکنائی میں پکتا تھا اور وسط ایشیا اور افغانستان کے پکوانوں کے مقابلے کا ہوتا تھا۔ تب تھریشر کی مشینیں نہیں تھیں۔ گندم کے گٹھوں کو کھلیان میں پھیلا دیا جاتا تھا۔ اُن پر بیل دوڑتے تھے اور تاراج کرتے تھے، یوں کہ دانہ دانہ الگ ہو جاتا تھا۔ تب ایلومینیم کے بنے ہوئے بھڑولے بھی نہیں تھے۔ مٹی کی بنی ہوئی سکاریوں میں غلہ ذخیرہ کیا جاتا تھا۔۔۔ مرنڈوں کی ان گنت قسمیں تھیں۔ چاول کے مرنڈے، چنوں کے مرنڈے، گندم کے مرنڈے، باجرے کے مرنڈے۔ جوار کی میٹھی پِنیاں بنتی تھیں۔ سوجی کی میٹھی روٹی جسے "پاپڑی" کہتے تھے"۔[۳]

محمد اظہار الحق جب اپنے کالموں میں مغرب اور اپنے ملک کی تہذیب اور ثقافت کا موازنہ پیش کرتے ہیں تو اہلِ مغرب کی اچھائیوں کے ساتھ ساتھ اپنے ہاں کی خامیوں کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ اُن کے ہاں منافقت نہیں ہے، وہ غیر مسلموں کی خوبیوں کا اعتراف بھی کھلے دل کے ساتھ کرتے نظر آتے ہیں۔ مثال کے طور پر اپنے ایک کالم "فحاشی کی تعریف" میں وہ لکھتے ہیں:

> "لندن کی زیرِ زمین ریل کے ڈبے میں تِل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ جتنے مسافر نشستوں پر بیٹھے تھے، اُتنے ہی یا شاید اُن سے بھی زیادہ کھڑے تھے۔ کچھ اخبار پڑھ رہے تھے اور کچھ کتاب۔ ایک خاتون نے جو نشست پر بیٹھی تھی، اپنا بیگ کھولا، میک اپ کا سامان نکالا اور بناؤ سنگھار کرنے لگی۔ پورے ڈبے میں کسی ایک شخص نے بھی اُس کی طرف نہ دیکھا۔ جب کہ دو سال پہلے کا واقعہ ہے۔ پاکستان کے ایک ہوائی اڈے پر چار پانچ پاکستانی ایک غیر ملکی مہمان خاتون کو الوداع کہنے آئے۔ جہاں وہ خاتون کھڑی تھی، ہجوم وہاں اکٹھا ہونے لگا۔ وہ سب اُس خاتون کو غور سے دیکھ رہے تھے۔ خاتون کے ارد گرد اتنا زیادہ ہجوم اکٹھا ہو گیا اور وہ سب اِس انداز سے اُسے دیکھ رہے تھے کہ الوداع کہنے والے میزبان خوف زدہ ہو گئے۔ ایئرپورٹ کی انتظامیہ نے صورت حال کی نزاکت کو سمجھا اور خاتون کو حفاظتی حصار میں لے کر ایک نسبتاً " محفوظ " کمرے میں پہنچا دیا۔ آپ کا کیا خیال ہے فحاشی کا اطلاق، اِن دونوں واقعات میں سے کس پر ہو گا؟ اللہ کی کتاب میں آنکھیں نیچے رکھنے کا جو اصول بتایا گیا ہے کون اُس پر عمل کر رہا ہے؟"[۱۴]

ہماری بد قسمتی ہے کہ ہمارے دینی احکامات پر غیر مسلم تو عمل کر رہے ہیں اور انھوں نے اسلام کے سنہری اصولوں کو اپنا کر مثالی انسانی معاشرہ تعمیر کر لیا ہے، مگر ہم خود ابھی تک اُن احکامات پر عمل درآمد کرنے سے کوسوں دور ہیں، جو معاشرے میں بہتری و بھلائی کے لیے بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔

ب)۔ محمد اظہار الحق کے کالموں میں تعلیم، کھیل اور مفادِ عامہ کا بیان:

تعلیم

اپنے وسیع تر معنوں میں تعلیم ایسی چیز ہے جس کے ذریعے لوگوں کے کسی گروہ کی عادات اور اہداف ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل ہوتے ہیں علاوہ ازیں تعلیم سے مراد وہ رسمی طریقہ کار ہے جس کے ذریعے کوئی معاشرہ اپنا مجموعی علم، ہنر، روایات اور اقدار ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل کرتا ہے، عموماً سکول یا کسی تعلیمی درسگاہ میں دی جانے والی تربیت تعلیم کہلاتی ہے۔ ایسی باقاعدہ اور باضابطہ تعلیم کو رسمی تعلیم کہا جاتا ہے جب کہ بے قاعدہ ذرائع سے حاصل کی جانے والی تعلیم غیر رسمی تعلیم کہلاتی ہے۔ تعلیم ہماری زندگی کا مرکز و محور ہے۔ کسی بھی معاشرے کی ترقی اور استحکام تعلیم ہی کی وجہ سے ممکن بنتا ہے۔ ایسے معاشرے جن میں تعلیم کی شرح زیادہ ہے وُہی زیادہ ترقی یافتہ ہیں اور جن ملکوں میں تعلیم کا فُقدان ہے یا وہاں تعلیم پر کم توجہ دی جاتی ہے تو وُہ ممالک کم ترقی یافتہ یا ہنوز پسماندہ ہیں۔ اِس لیے بلا مبالغہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ کسی بھی ملک کی ترقی میں تعلیم کو کلیدی اہمیت حاصل ہے یہی وجہ ہے کہ تعلیم اور اِس سے منسلکہ مسائل پر اردو کے ہر کالم نگار نے اظہارِ خیال کیا ہے، اِن میں سے اکثر کالم نگار حکومت کو اعلیٰ اور معیاری تعلیم فراہم کرنے اور اِس پر زیادہ توجہ دینے کا مشورہ دیا کرتے ہیں۔ بعض اوقات کوئی کالم نگار کسی مخصوص سلیبس پر تبصرہ بھی کر دیتا ہے اور بعضِ اوقات تعلیمی بہتری کے لیے کچھ تجاویز بھی دے دیتا ہے۔ اپنے کالم "زیرو پوائنٹ" میں جاوید چودھری لکھتے ہیں:

> "دنیا میں اس وقت گیارہ بڑی بدھ ریاستیں ہیں، جاپان، چین، سری لنکا، تھائی لینڈ، لاؤس، کمبوڈیا، برما، منگولیا، ویت نام، شمالی کوریا اور جنوبی کوریا۔ ان گیارہ ممالک میں سے تین کا شمار فرسٹ ورلڈ میں ہوتا ہے۔ جاپان، چین اور جنوبی کوریا وہ ممالک ہیں جو ٹیکنالوجی، علم اور سرمائے کے لحاظ سے "سپر پاور" ہیں اور یہ تینوں ممالک ٹیکسلا کو اپنا ویٹی کن سمجھتے ہیں چنانچہ اگر ڈاکٹر عبد القدیر جولیاں کی دو ہزار سات سو سال پرانی یونیورسٹی کی تعمیرِ نو کا اعلان کر دیں یا یہ ٹیکسلا میں دنیا کی قدیم ترین درس گاہ میں جدید ترین یونیورسٹی قائم کرنے کا بیڑہ اُٹھالیں تو یہ گیارہ ممالک اُن کی کی بھرپور مدد کر سکتے ہیں، صرف ٹوکیو شہر میں ایک ہزار یونیورسٹیاں ہیں جب کہ چین کی بیجنگ یونیورسٹی کا شمار دنیا کی ۲۰ بڑی یونیورسٹیوں میں ہوتا ہے اگر ڈاکٹر صاحب ٹوکیو کی

دس اور چین کی ایک یونیورسٹی کا تعاون حاصل کر لیں تو پاکستان کی نوجوان نسل پانچ برسوں میں اندھیرے سے روشنی میں آسکتی ہے چنانچہ ڈاکٹر صاحب ٹیکسلا، گندھارا یا بودھ یونیورسٹی کے نام سے ادارہ قائم کر لیں، جو لیاں کے آثار کے گرد پہاڑوں میں عمارتیں بنانے کا آغاز کریں اور پھر دیکھیں اللہ کہاں کہاں سے کرم کرتا ہے۔ اِس ملک کی بجھی بھٹیوں سے کون کون سی چنگاری اُڑتی ہے اور اس ملک کی فضاؤں میں کون کون سے رنگ بکھرتے ہیں"۔[۱۵]

علم کا حصول ہمارے مذہب میں بھی ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض قرار دیا گیا ہے اور چین کی حکمت و دانائی کا اعتراف تو پوری دنیا کرتی ہے اپنی اسی علم و دانش کو بروئے کار لاتے ہوئے آج چائنہ معاشی لحاظ سے پوری دنیا میں بلا شرکت غیرے سپر پاور کی حیثیت رکھتا ہے اور جدید علوم و فنون سے مستفید ہوتے ہوئے صنعتی میدان میں چین دنیا کے ہر ترقی یافتہ ملک سے آگے ہے۔ کسی بھی اچھے صحافی کی یہ خوبی ہوتی ہے کہ وہ صحافت کے فن کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اچھی اور معیاری تحریر پیش کرے اور ایسی ہی معیاری تحریریں آگے چل کر ادب میں شامل ہو جاتی ہیں۔ اور محمد اظہار الحق کی تحریریں بھی بلاشبہ ایسی ہی دِل کو موہ لینے والی ہوتی ہیں۔ جہاں تک ادب اور صحافت کے تعلق کی بات ہے تو شروع سے ہی عیاں ہے کہ صحافی اور ادیب ایک دوسرے سے الگ نہیں ہوتے۔ ایک اچھا صحافی اچھا ادیب بھی ہوتا ہے اور ایک اچھا ادیب اچھا صحافی بھی ہو سکتا ہے۔

پروفیسر محمد شاہد حسین کے بقول:

"صحافت میں بھی کہیں کہیں ایسے مقام آتے ہیں جہاں ادب اور صحافت ایک ہو جاتے ہیں۔ پھر اخبارات میں لکھے گئے کالم اور مضامین عموماً ادیبوں کے لکھے گئے ہوتے ہیں۔ رسالوں میں تو زیادہ تر ادیب ہی لکھتے ہیں، لہذا ادب اور صحافت کے درمیان کوئی سیدھی لکیر نہیں کھینچی جاسکتی ہے"۔[۱۶]

محمد اظہار الحق کی تحریریں بھی ایسی ہی خصوصیات کی حامل ہوتی ہیں، جو صحافتی حلقوں کے ساتھ ساتھ ادبی حلقوں میں بھی اپنا اہم مقام رکھتی ہیں اور ہر قسم کے عوامی دلچسپی کے موضوعات پر مشتمل ہوتی ہیں۔

کھیل

اخبارات کے کالموں کا اہم موضوع کھیل یا کھلاڑی سے متعلق مضامین شامل کرنا بھی ہے۔ کھیل انسانی زندگی کا لازمی جزو ہے۔ دنیا میں کوئی معاشرہ بھی ایسا نہیں ہے جہاں کھیل نہ کھیلے جاتے ہوں۔ عالمی سطح پر بے شمار کھیلوں کے، کئی بین الاقوامی مقابلوں کا انعقاد کرایا جاتا ہے۔ آج کل کھیل اور کھلاڑی روز مرّہ خبروں کا اہم موضوع ہوتے ہیں۔ اخبارات کا بھی مکمل صفحہ یا مخصوص حصہ کھیلوں سے متعلقہ خبروں اور مضامین کے لیے مختص ہوتا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ کھیل اور اُن سے منسلک کھلاڑیوں کی کارگردگی کے بارے میں کالم بھی چھپتے رہتے ہیں، بعض رسائل و جرائد صرف کھیلوں کی خبروں اور تبصروں کے لیے شائع ہوتے ہیں۔ کھیلوں کی اہمیت وافادیت پر لکھے گئے روزنامہ "امروز" کے ایک کالم کا یہ اقتباس پیشِ خدمت ہے:

> "دنیا بازیچۂ اطفال ہو یا نہ ہو لیکن زندگی اور بازیچۂ اطفال میں بہت گہرا تعلق ہے۔ زندگی کو کھیل نہیں کہا جا سکتا، پھر بھی کھیل سے اس کا گہرا رشتہ ضرور ہے۔ کھیل کود کے مشغلے کو آدمی فطری طور پر پسند کرتا ہے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ شوق اُس کی سرشت میں داخل ہے۔ یہ اور بات ہے کہ آلامِ زندگی اور مشاغلِ حیات میں مصروف ہو کر آدمی کھیل کے لیے وقت نہ نکال سکے اُس پر سنجیدگی اس قدر غالب آ جائے کہ وہ کھیل کود کے مشغلوں کو اپنے شایانِ شان نہ سمجھے، حالانکہ کھیل ایک ایسا ستون ہے، جس پر ایوانِ زندگی قائم ہے"۔[۷]

کھیل دو قسموں کے ہوتے ہیں۔ (۱) اندرونی کھیل یا اِن ڈور گیمز، اور (۲) بیرونی کھیل یا آؤٹ ڈور گیمز اندرونی کھیل صرف گھر کے اندر ہی کھیلے جاسکتے ہیں جب کہ بیرونی کھیل گھروں سے باہر کھیلے جاتے ہیں اور اِن کھیلوں میں جو فائدے ہوتے ہیں، وہ کبھی بھی گھر کے اندر والے کھیلوں سے حاصل نہیں ہوسکتے۔ بیرونی کھیل دماغ کو تروتازگی اور تفریح دینے کے ساتھ ساتھ انسان کی صحت اور اُس کے جسم پر اچھا اور مثبت اثر ڈالتے ہیں اِس لیے یہ کہنا مبالغہ نہیں کہ کھیلوں میں خوشگوار اور پُر مسرت زندگی کا راز پوشیدہ ہے۔

مفادِ عامہ

عوامی فلاح و بہبود اور مفادِ عامہ ہر حکومت کی ترجیح اور کوشش ہوتی ہے۔ ہر عہد میں، ہر مخلص حکمران عوام الناس کو زیادہ سے زیادہ سہولیات اور ترقی فراہم کرنے کے لیے کوشاں رہا ہے اور وہی حکمران تاریخ کے صفحات میں اچھے لفظوں سے یاد کیے جاتے ہیں، جنھوں نے عوام کے مفادِ عامہ کا خاص خیال رکھا ہوتا ہے اور اِس سلسلے میں کارہائے نمایاں سرانجام دیے ہوتے ہیں۔ حدیثِ نبوی ﷺ ہے:

حدثنا اِسماعیل،حد ثنیی مالک،عن عبداللہ بن دینار،عن عبداللہ بن عمر اَن رسول اللہ ﷺ یقول کلکم راع و کلکم مسئول عن رعیتہ۔

آپ ﷺ نے فرمایا:

"آگاہ ہو جاؤ تم میں سے ہر ایک نگہبان ہے اور ہر ایک سے اس کی رعایا کے بارے میں سوال کیا جائے گا"۔ [۱۸]

عہدِ نبوی ﷺ کے بعد خلفائے راشدین کے دورِ خلافت میں بھی اور بعد میں حضرت عمر بن عبد العزیز کے دورِ حکومت میں خصوصاً عوام کے مفادات کا پورا پورا خیال رکھا گیا مگر المیہ یہ ہے کہ آج چودہ سو سال سے زیادہ عرصہ گزر جانے کے بعد ہم مادی لحاظ سے تو ترقی یافتہ ہوتے جا رہے ہیں، مگر عوامی مفادات کی فراہمی روز بروز پست سے پست سطح پر آتی جا رہی ہے۔ محمد اظہار الحق جب اپنے کالموں میں اِس دکھ کو بیان کرتے ہیں تو اُن کا انداز دل میں اتر جانے والا ہوتا ہے اور دل کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتا ہے۔ وہ اپنے کالم "کیا ہمارے ڈاکٹر" میں ہمارے ملکی اور آسٹریلیا کے ہسپتالوں کی سہولیات اور ڈاکٹروں کا موازنہ کرتے ہوئے بتاتے ہیں:

"الطاف سے قرابت تھی۔ ہم گاؤں میں پڑوسی تھے اور ہمجولی بھی۔ اس نے گیس اور تیل کے نیم خود مختار ادارے میں ملازمت کر لی اور دور افتادہ مقامات پر رہا۔ غالباً دس سال پہلے کی بات ہے جب اسے دل کے عارضے نے آ گھیرا۔ اس کا محکمہ ریٹائرڈ ملازمین کے حق میں فیاض ہے۔ راولپنڈی کے ایک بڑے نام اور وقار والے ہسپتال میں اس کا علاج ہوا۔۔۔ چند دن بعد خبر ملی کہ الطاف کا انتقال ہو گیا۔ آج تک الطاف کی یاد جب بھی آتی ہے یا مشترکہ عزیزوں سے اس کا ذکر چھڑتا ہے تو اس کی ایک ہی تصویر دماغ کے پردے پر ابھرتی ہے۔ کھلی آنکھیں، سوجا ہوا پیٹ اور بازو پر رکھا

ہاتھ۔ایک ثانیے کے بعد یہ تصویر محو ہو جاتی ہے۔ پھر ان کے بیٹے ظفر کی ہچکی سنائی دیتی ہے۔ چاچا جی ان ظالموں نے مجھے کچھ بھی نہیں بتایا۔ میں ابو سے مل سکا نہ بات ہی کی۔ گزشتہ ہفتے آسٹریلیا میں ایک دوست کے ساتھ ہسپتال میں ایک دن گزارنے کا اتفاق ہوا۔ اس پاکستانی دوست کا آپریشن ہونا تھا۔ آپریشن سے دو دن پہلے ڈاکٹر کے پاس گئے، ڈاکٹر اپنے کمرے سے نکلا، ہنس کر ہاتھ ملایا اپنے کمرے کا دروازہ ہمارے لیے کھولا اور اندر لا کر کرسیوں پر بٹھایا۔ اگر ہمارے سامنے کسی اور مریض اور اس کے لواحقین کو اس طرح لایا جاتا تو ہمیں یقین ہو جاتا کہ یہ لوگ بڑے لوگ ہیں، وی آئی پی یا ڈاکٹر کے جاننے والے ہیں۔ اس کے بعد ڈاکٹر نے اس کارروائی کی مکمل تفصیل بتانا شروع کی جو دو دن بعد ہونا تھی۔ مکمل تفصیلات بیان کرنے کے بعد ڈاکٹر نے مریض اور دونوں لواحقین سے الگ الگ پوچھا کہ آپ کچھ مزید پوچھنا چاہتے ہیں؟ اس کے بعد وہ اٹھا، خود دروازہ کھولا اور یوں رخصت کیا جیسے یہ ایک سماجی ملاقات تھی۔ دو دن بعد آپریشن والے دن جب مریض کو آپریشن تھیٹر میں لے گئے تو ہم ہسپتال کی کینٹین میں جا کر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر بعد ڈاکٹر کینٹین میں ہمارے سامنے موجود تھا۔ وہ سبز رنگ کی یونیفارم پہنے تھا اور پلاسٹک کی سفید ٹوپی۔ وہ ہمارے ساتھ، کرسی پر بیٹھ گیا، پوری تفصیل بتائی۔ طبی نکتہ نظر سے اور ذاتی نکتہ نظر سے ایک ایک پہلو پر روشنی ڈالی۔ جب ہم مطمئن ہو گئے تو مسکرا کر ہاتھ ملایا اور واپس دوسری منزل پر چلا گیا۔ مریض کو ہسپتال سے واپس لے جاتے ہوئے میرے دماغ کی سکرین پر ایک ہچکی ابھر رہی ہے۔ "چاچا جی ان ظالموں نے مجھے کچھ بھی نہیں بتایا۔ میں ابو سے مل سکا نہ بات ہی کی"۔ ایک سوال ہے۔ صرف ایک سوال۔ صرف ایک۔ کیا ہمارے ڈاکٹر آپریشن کے بعد مریض کے لواحقین کو مل کر جملہ تفصیلات سے آگاہ کر سکتے ہیں؟ کیا وہ ایسا کریں گے؟"[۱۹]

محمد اظہار الحق اپنے کالموں میں یہ المیہ بڑے کرب سے بیان کرتے ہیں کہ موجودہ عہد میں مجموعی ترقی کے حوالے سے آسٹریلیا یورپ اور امریکہ سے ہنوز پیچھے ہے، پھر بھی اگر اُس ملک میں عوامی فلاح اور مفادِ عامہ کا اتنا خیال رکھا جاتا ہے تو یورپ اور امریکہ تو اِس سے کہیں آگے ہیں، اُن ممالک میں تو انسانی مفادات اور سہولیات کی سطح زیادہ بلند ہو گی جب کہ ہمارے ملک میں عوام کا پُرسانِ حال کوئی نہیں ہے۔ کوئی ایک ادارہ بھی ایسا نہیں جو عوام کے مفادات مکمل طور پر فراہم کر رہا ہو۔ نہ ہی صحت کے شعبے میں اور نہ ہی تعلیم کے شعبے میں عوام کو عالمی معیار کے عشرِ عشیر سہولیات حاصل ہیں۔ بے روزگاری عام ہے۔ سہولیاتِ زندگی تو دور کی بات عوام کو مکمل ضروریاتِ زندگی حاصل نہیں ہیں۔ محمد اظہار الحق اپنے کالموں میں یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ ہمارے ملک میں وسائل بھی ہیں، نوجوانوں میں اہلیت بھی ہے مگر ہم پھر بھی ترقی کی دوڑ میں جدید دنیا سے پیچھے ہیں۔ اپنے کالم "نظر نہ آنے والا نظام" میں محمد اظہار الحق ایسے ہی ایک محنتی اور ذہین طالب علم کا سچا واقعہ بیان کرتے ہیں، وہ بتاتے ہیں کہ ایک خبر کے مطابق فتح جنگ کے قریب واقع چھوٹے سے گاؤں کے انتہائی غریب گھرانے کے بچے عمر حیات نے راولپنڈی بورڈ سے ایف۔ اے کے امتحان میں اول پوزیشن حاصل کی ہے، معلوم ہوتا ہے کہ جو نظام ہمارے ہاں جاری وساری ہے اور جس کے جاری رہنے پر ہم عملاً اصرار کیے جا رہے ہیں اس کے علاوہ بھی ایک نظام ہے جو اگرچہ ہماری نظروں سے اوجھل ہے لیکن جس کا چلانے والا کبھی کبھی کہیں کہیں اس کی ایک آدھ جھلک دکھلاتا ہے تاکہ ہمیں یہ احساس ہو سکے کہ ہمارا نظر آنے والا ظاہری نظام کتنا بودا، کھوکھلا، مضحکہ خیز اور بے بنیاد ہے۔ بقول محمد اظہار الحق:

> "عمر حیات نے گاؤں کے ایک انتہائی غریب گھرانے میں آنکھ کھولی جب وہ پڑھنے کی عمر کو پہنچا تو گاؤں کے واحد پرائمری سکول میں داخل ہو گیا۔ کٹھن حالات کے باوجود عمر حیات نے پانچ جماعتیں پاس کر لیں یہ اس کے چھوٹے سے گاؤں میں تعلیم کی انتہا تھی لیکن اس نے دم نہیں لیا، اس نے قریب کے نسبتاً ایک بڑے گاؤں میں اگلی کلاس میں داخلہ لے لیا، اب وہ ہر روز صبح پیدل سفر کرتا اور چھٹی کے بعد اپنے گاؤں کو لوٹتا۔ مینہ، بارش، آندھی، گرمی، جاڑا، اس نے سارے موسم اور موسموں کی

سختیاں اِس راستے پر چکھیں اور میٹرک کے امتحان میں ساڑھے آٹھ سو میں سے سات سو پندرہ نمبر حاصل کیے! یہ خواب جو بے شمار کھاتے پیتے آسودہ حال بچوں نے دیکھا تھا، گرا تو مفلس کی جھولی میں گرا! لیکن اب ایف۔ اے میں داخلہ کیسے ملتا؟ عمر حیات کی جیب خالی تھی اور اس کے ماں باپ تہی دست تھے۔ چنانچہ عمر حیات کے لیے کالج میں داخلے کا کوئی بندوبست بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن اس نے ہمت نہ ہاری، اس نے کالج میں داخلے کا خواب تو تھیلے میں ڈال کر دیوار پر لٹکا دیا اور خود گاؤں سے چل کر فتح جنگ شہر میں آ گیا، اس کی آنکھوں میں چمک تھی اور دل میں فولاد سے زیادہ مضبوط ارادہ، اس نے ایک پرائیویٹ پی سی او میں نوکری کر لی اور ساتھ اپنی کتاب اور کاپی رکھ لی۔ یہ اس کی ملازمت اور ٹھکانہ تو تھا ہی اس کا کالج بھی یہی تھا، وہ کالیں ملاتا رہا اور ساتھ ساتھ پڑھتا رہا، شام ہوتی تو وہ بس میں بیٹھ جاتا، پندرہ میل کا سفر طے کرتا، ڈوبتی ہوئی شام کو اپنے بس سٹاپ پر اترتا، کچھ سفر پیدل کرتا، رات گاؤں کے کچے گھر میں بان کی چارپائی پر گزارتا اور صبح ماں کا بوسہ اپنے زرد رخسار پر لے کر پھر شہر کا رخ کر لیتا، یہ ماں کا بوسہ جو ہر صبح اس کے رخسار پر ثبت ہوتا، اس کا سب سے قیمتی زاد راہ تھا۔ یہ بوسہ اسے بھوک میں توانائی بخشتا، یہ بوسہ بارش اور دھوپ میں چھتری بن جاتا اور کتاب سامنے آتی تو یہی بوسہ اس کے ذہن کے اندر روشنی دیتا ہوا چراغ بن جاتا۔ وہ تو اچھا ہوا کہ کچھ چیزوں کی تقسیم کائنات پیدا کرنے والے نے اپنے ہاتھ میں رکھ لی ورنہ خدا کی قسم! غریبوں کو ہوا، روشنی، پانی اور ماں کا بوسہ بھی نہ ملتا، یہ نعمتیں بھی صرف ان کے حصے میں آتیں جن کے پاس وزیروں، امیروں اور ممبروں کی پرچیاں ہیں۔ عمر حیات کی خوش قسمتی سے ذہانت بھی ان چیزوں میں شامل تھی جن کی تقسیم خدا نے براہِ راست اپنے ہاتھ میں رکھی، عمر حیات کی جانکاہ اور اندوہناک محنت ٹھکانے لگی، نظر نہ آنے والے نظام نے اپنا کام کیا۔ عمر حیات پرائیویٹ امیدوار کے طور پر ایف اے کے امتحان میں بیٹھا اور بورڈ میں اول

آیا۔ اے اہلِ وطن! اس خاک میں بے شمار عمر حیات بکھرے ہوئے ہیں، خدا کے لیے انھیں تلاش کرو اور ان کے ہاتھ تھامو! ذرا ان خاک آلود قریوں کی طرف تو دیکھو، جہاں سڑکیں ہیں نہ برقی روشنی، لیکن جہاں تمہارے لعل، تمہارے ہیرے اور تمہارے ستارے جاگ اٹھنے کا انتظار کر رہے ہیں!"[۲۰]

محمد اظہار الحق کا یہ کالم کوئی فرضی قصہ، تصوراتی داستان یا خیالی کہانی نہیں ہے، بلکہ یہ سچا واقعہ ہے، میں اس کالم کے مرکزی خیال عمر حیات سے بذاتِ خود ملا ہوں، موصوف بالکل انھی کٹھن حالات سے گزر کر تعلیمی مراحل شاندار انداز سے طے کرنے کے بعد اِس وقت اسلام آباد میں مقیم ہے اور اقتصادی شعبے میں ایک غیر ملکی ادارے کے زیرِ سایہ اپنے فرائضِ منصبی خوش اسلوبی کے ساتھ سر انجام دے رہا ہے، حال ہی میں عمر حیات نے اپنے غریب والدین کو اپنے ساتھ عمرہ کروایا ہے، اور بوڑھے والدین نے درِ رسول ﷺ کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے بیٹے کی مزید کامیابیوں کے لیے دعائیں کی ہیں۔

محمد اظہار الحق اپنے کالموں میں کہیں کہیں یہ دکھ بھی بیان کرتے نظر آتے ہیں کہ اِس ملک نے تو ہر کسی کے ساتھ وفا کی ہے، ہر دکھی کا درد بانٹا ہے، ہر آرزومند کی آرزؤں اور امیدوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا ہے مگر بدلے میں اکثریت نے اِس دھرتی کے ساتھ وفا نہیں کی، کوئی اِس ملک کو دولخت کرنے کی سازش میں شریک رہا، کوئی اب بھی اِس کی آزاد فضاؤں میں سانسیں لینے کے باوجود اِس پاک وطن سے شکوہ کناں ہی نظر آتا ہے۔ اِس دھرتی کا المیہ ہے ہے کہ یہاں بسنے والے یہ بھولتے جا رہے ہیں کہ ہمارا وطنِ عزیز دنیا کی وہ واحد اسلامی ریاست ہے جو اسلام کے نام پر قائم ہوئی ہے۔ وفات سے کچھ عرصہ پہلے بانیٔ پاکستان قائداعظم محمد علی جناح نے اس اسلامی ریاست۔۔۔ مملکتِ خداداد پاکستان کے قیام کا ذکر اور خداوندِ بزرگ و برتر کی اِس بے پایاں رحمت پر سجدۂ شکر ادا کرتے وقت فرمایا تھا۔ پروفیسر محمد حنیف شاہد کے بقول:

"کیا کسی قوم پر اِس سے بڑھ کر خدا کا کوئی اور انعام ہو سکتا ہے؟ یہی وہ "خلافت" ہے جس کا وعدہ خدا نے رسولِ اکرم ﷺ سے کیا تھا کہ اگر تیری امت نے صراطِ مستقیم کو اپنے لیے منتخب کر لیا تو ہم اسے زمین کی بادشاہت دیں گے۔ خدا کے اِس

انعامِ عظیم کی حفاظت اب مسلمانوں کا فرض ہے، پاکستان تحفۂ خداوندی ہے اور اِس
"تحفہ" کی حفاظت ہر پاکستانی مرد، عورت، بچے، بوڑھے اور جوان پر فرض ہے"۔[۲۱]

بد قسمتی سے ہم اِس تحفۂ خداوندی کی ٹھیک طرح سے قدر نہیں کر سکے ہیں اور آج اسلامی دنیا کی واحد ایٹمی طاقت ہونے کے باوجود ہم دنیا بھر میں بے وُقعت اور کم تر سمجھے جاتے ہیں جو اپنا کاسۂ گدائی بھیلائے دنیا کے کونے کونے میں بدنام ہو چکے ہیں۔ دوسری طرف ہمارے حکمرانوں نے ملکی دولت لوٹ لوٹ کر غیر ملکی بنک اور تجوریاں بھر رکھی ہیں۔ محمد اظہار الحق نے اپنے کالم " واہ !پاکستان! تیری بھی کیا قسمت ہے!" میں اِسی کرب کو اِن الفاظ میں بیان کیا ہے:

"واہ !پاکستان! تیری بھی کیا قسمت ہے! تو وہ تھالی ہے کہ جو تجھ سے کھاتا ہے، تجھی
میں چھید کرتا ہے!" [۲۲]

محمد اظہار الحق جدید تعلیمی نظام اور معاشرتی جدتوں کے خلاف ہیں کہ ان کی وجہ سے بچوں کے پاس کھیلنے کے مواقع کم ہوتے جارہے ہیں، اربابِ اقتدار کو اِس بارے میں لازمی طور پر سوچنا چاہیے اور کھیلوں کی بہتری اور فروغ کے لیے ہر ممکن اقدامات کرنے چاہییں تا کہ ہماری نوجوان نسل پڑھائی کے ساتھ ساتھ کھیلوں کی سرگرمیوں میں بھرپور طریقے سے شامل ہو سکے۔ اپنے کالم "احمقانہ سوالات" میں محمد اظہار الحق لکھتے ہیں:

"کرکٹ کے ہیرو خود تو انگلینڈ اور آسٹریلیا کے مزے لوٹتے رہے اور ان بچوں کو گلی
ڈنڈے اور کبڈی کی مسرتوں سے بھی محروم کر دیا۔ ٹی وی، وی سی آر اور اب کمپیوٹر
ہی ان بچوں کی تفریح گاہیں بھی ہیں اور کھیل کے میدان اور کلب بھی، خواہ ان پر یہ
کارٹون دیکھیں یا طلاق سے بھرپور ڈرامے، سکولوں میں ان کے لیے کھیل کے پیریڈ
لازمی نہیں ہوتے بلکہ سرے سے ہوتے ہی نہیں جب کہ تمام مہذب ملکوں میں
کھیل کے پیریڈ لازمی ہوتے ہیں اور پاس ہونے کے لیے کھیلوں میں مطلوبہ نمبر
حاصل کرنا ضروری ہوتا ہے۔ لیکن جہاں فلیٹوں میں سکول کھلے ہوئے ہوں اور جہاں
سکول کھولنا، پان سگریٹ کا کھوکھا لگانے سے بھی زیادہ آسان ہو وہاں بچوں کی تفریح

اور کھیلوں کے بارے میں یہ تمام سوالات احمقانہ ہیں اور یہ احمقانہ سوالات اٹھانے پر
میں اپنے قارئین سے معافی چاہتا ہوں"۔[۲۳]

ج)۔ محمد اظہار الحق کے کالموں میں سائنس اور سیاحت کا ذکر:

سائنس

ایک منظم طریقۂ کار کے تحت کسی بات کو جاننے یا اُس کا علم حاصل کرنے کو سائنس کہا جاتا ہے۔ انگریزی میں سائنس کا لفظ لاطینی زبان کے لفظ Scientia اور اس سے قبل یونانی زبان کے لفظ skhizein سے آیا ہے، جس کے معنی ہیں الگ کرنا یا چاک کرنا۔ سائنس کے لفظ کا جدید استعمال سترہویں صدی کے اوائل سے سامنے آیا ہے۔ انسان کے سائنسی مطالعے کا سلسلہ زمانۂ قدیم سے جاری ہے اور زمانے کے ساتھ ساتھ اِس علم میں اضافہ اور بہتری ہوتی رہی ہے، اسی علمی ترقی کی وجہ سے سائنس آج کے عہد میں موجودہ ترقی یافتہ شکل تک پہنچ چکی ہے۔ آنے والے سائنس دانوں نے ہمیشہ گزشتہ سائنس دانوں کے تجربات و مشاہدات کو سامنے رکھ کر ہی نئی نئی پیش گوئیاں کرنے کی کوشش کی ہے اور سائنس کے دامن میں خاطر خواہ اضافہ بھی کیا ہے۔ بہر حال سائنس قدیم ہو یا جدید، بنیادی ہو یا اطلاقی اِس کے مطالعے کا اہم ترین عنصر اِس کا اسلوبِ علم یا سائنسی طریقۂ کار ہوتا ہے۔ ویسے تو سائنس اور سائنسی علوم حیاتِ انسانی کے ساتھ ہی وجود میں آ گئے تھے، جوں جوں انسانی معاشرہ منظم ہوتا گیا، ساتھ ساتھ سائنسی علوم بھی نہ صرف ترقی کرتے گئے بلکہ زبانوں کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ علمِ سائنس کو ضبطِ تحریر میں لا کر آنے والی نسلوں کے لیے محفوظ بھی بنایا جاتا رہا۔ آج کے عہد میں حیرت انگیز انسانی ترقی سائنسی علوم کی وجہ سے ہی ممکن ہوئی ہے۔ سائنس کی بے حساب ترقی کی وجہ سے ہی پچھلی صدی کو سائنس کی صدی بھی کہا جاتا ہے اور یہی وہ صدی ہے جس میں صحافت اور اخبارات کو عروج حاصل ہوا ہے اور اخباری تحریروں خاص طور پر کالموں میں دیگر شعبوں کے ساتھ ساتھ سائنس، سائنسی ایجادات اور سائنسی علوم کو بھی بڑے پیمانے پر شامل کیا گیا۔ نوّے کی دہائی میں روزنامہ "جنگ" میں شائع

ہونے والے پاکستان کے معروف سائنس دان ڈاکٹر منیر احمد کے ایک مضمون بعنوان "سائنسی، صنعتی ارتقاء اور معاشرتی تعصبات" میں سے ایک اقتباس بطورِ خاص پیشِ خدمت ہے:

> "تاریخی شواہد بتاتے ہیں کہ ہماری تہذیب چند ہزار سال پرانی ہے۔ مگر کئی صدیوں تک سائنسی اور صنعتی ارتقاء رکا رہا، اس کی چند وجوہات ہیں، جن میں ایک بنیادی وجہ معاشرتی تعصبات ہیں۔ آج بھی ترقی پذیر اور پس ماندہ ممالک میں یہ تعصبات سائنسی اور صنعتی ارتقاء کے راستے میں رکاوٹیں پیدا کر رہے ہیں۔ اِس کی ایک مثال ہمارے علماء کی ہے۔ وہ تعلیم کی اسلامائیزیشن کا ذکر کرتے ہیں اور اسے شریعت بل کا ایک حصہ بنا دیا گیا ہے۔ اِس سے ان کی کیا مراد ہے وہ ابھی تک اِس کی کوئی تفصیل پیش نہیں کر سکے لیکن وہ مذہبی تعصّبات کا بھڑکا کر اپنے مفاد کے لیے اِس کھوکھلے نعرے میں جان ڈال رہے ہیں، جدید تقاضوں کے تحت تعلیم کی مقصدیت کو کاری ضرب لگا رہے ہیں۔ چند صدیوں پہلے مغرب میں بھی ایسی سوچ نے سائنسی اور صنعتی ترقی کے راستے مسدود کر رکھے تھے"۔[۲۴]

یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ اِس سائنسی اسلوب میں بھی زمانے کے ساتھ ساتھ ترقی اور باریکیاں پیدا ہوتی رہی ہیں اور آج کوئی بھی سائنسی مطالعہ یا تجربہ اسلوبِ سائنس پر پورا اترے بغیر قابلِ توجہ نہیں سمجھا جاتا ہے۔ المیہ یہی ہے کہ وقت کے بدلتے تقاضوں کے ساتھ مسلمانوں نے خود کو جدید علوم اور سائنسی تحقیق سے ہم آہنگ نہیں کیا ہے، یہی وجہ ہے کہ مسلمان آج دنیا بھر میں ترقی اور تحقیق کی دوڑ میں ترقی یافتہ ممالک سے بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ محمد اظہار الحق نے اپنی کالم نگاری میں سائنسی میدان میں مسلمانوں کی زبوں حالی کے بارے میں بھی بہت کھل کر بات کی ہے۔ وہ مسلمانوں کی بے علمی اور بے عملی پر طنز کرتے ہوئے گہری چوٹ کرتے ہیں۔ اپنے ایک کالم "پہاڑ سر بن کا" میں وہ لکھتے ہیں:

> "ہم پاکستانی اتنے "عظیم" ہیں کہ شملہ پہاڑی کی چوٹی پر کوئی درخت، کوئی بنچ ایسا نہیں، جس پر نام نہ کھدے ہوں اور ایڈریس نہ لکھے ہوں۔ دوسری قوموں نے اپنے

نام ایجادات اور دریافتوں سے زندہ رکھے ہیں۔ کسی نے دنیا کو پنسلین کا تحفہ دیا، کسی نے برقی روشنی کا، کسی نے انٹرنیٹ اور کسی نے موبائل فون کا کہ جس کے بغیر آج ہمارے خاکروب کا گزارا بھی نہیں ہوتا۔ لیکن ہم چونکہ انسانیت کو کچھ نہیں عطا کر سکے، اِس لیے نام زندہ رکھنے کی ایک ہی صورت ہے کہ شاپنگ بیگ، چپس کے ٹکڑے، خالی ڈبے اور ٹوٹی ہوئی بوتلیں سیر گاہوں میں اِدھر اُدھر بکھیر کر، درختوں اور بنچوں پر اپنے نام کھود دیں اور یوں تاریخ کے آسمان پر ستاروں کی طرح روشن رہیں"۔[۲۵]

محمد اظہار الحق نے وطنِ عزیز سے باہر رہنے والے دانش وروں اور سائنس دانوں کی بھی کھل کر تعریف کی ہے، چاہے وہ دنیا کے جس حصے میں بھی رہتے ہوں اور کسی ملک کے لیے بھی اپنی خدمات سر انجام دے رہے ہوں، اِس سلسلے میں ایک بڑا نام بھارت کے سابقہ صدر ڈاکٹر عبد الکلام کا ہے، محمد اظہار الحق نے اپنے کالم "جزیرہ اور املی کے بیج" میں ڈاکٹر عبد الکلام کی پوری کہانی بیان کی ہے، یہ کہانی انسانی حوصلے، ہمت اور جدوجہد کی اعلیٰ مثال ہے، محمد اظہار الحق اپنے کالم میں لکھتے ہیں کہ بھارت سے دشمنی اپنی جگہ مگر عبد الکلام کی زندگی میں ہمارے لیے کئی سبق پوشیدہ ہیں، وہ جو عربی میں کہتے ہیں کہ غور اِس پر کرو کہ کیا کہا گیا ہے، یہ نہ دیکھو کہ کہنے والا کون ہے۔ اسی طرح محمد اظہار الحق نے اپنے کالموں میں پاکستانیوں اور مسلمانوں کی طرف سے کیے جانے والے اچھے تحقیقی کاموں کی بھرپور تعریف بھی کی ہے، انھوں نے اپنے کالم "چراغ" میں پاکستان کے چوٹی کے ماہرِ معاشیات محمد اکرم خان کے بارے میں تفصیل کے ساتھ لکھا ہے کہ محمد اکرم خان اقتصادیات کے شعبے میں بین الاقوامی شہرت رکھنے والے دانش ور ہیں، چار عشروں سے مستقل مزاجی کے ساتھ اقتصادیات کے میدان میں تحقیقی کام کرنے کا نتیجہ یہ ہے کہ آج مغربی دنیا کے سکالرز اُن کے نام سے بخوبی آشنا ہیں اور آج دنیا میں اقتصادیات پر اسلامی حوالے سے جہاں بھی کوئی مباحثہ ہو یا کانفرنس، یا اِس حوالے سے کوئی سیمینار ہو تو اکرم خان کو ضرور مدعو کیا جاتا ہے جو اُن کی علمی تحقیق کا برملا اعتراف ہے۔

سیاحت

سیاحت تفریحی، صحت افزاء اور فرحت بخش قدرتی نظاروں کو دیکھنے کے مقاصد کے لیے کیا جانے والا سفر ہے۔ موجودہ زمانے میں سیاحت ایک مقبول عالمی تفریحی سرگرمی بن چکی ہے۔ سیاحت نہ صرف سیر و تفریح اور صحت افزائی کے لیے مفید ہے بلکہ سیاحت سے مقامی آبادی اور اُس ملک کی معیشت کو کافی حد تک تقویت ملتی ہے۔ لوگوں کو کام کے مواقع زیادہ فراہم ہوتے ہیں۔ سیاحت سے مختلف ثقافتوں اور خطے سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو آپس میں ایک دوسرے کو سمجھنے کا موقع ملتا ہے اور مختلف اچھی چیزیں ایک معاشرے سے دوسرے معاشرے میں رائج ہو جاتی ہیں۔ سیاحت کی مختلف قسمیں ہیں جیسا کہ قدرتی نظاروں کو دیکھنے والی سیاحت، مذہبی سیاحت جس میں لوگ مختلف مذہبی جگہوں کو دیکھنے جاتے ہیں، تاریخی سیاحت جس میں لوگ آثارِ قدیمہ اور مختلف تاریخی نوعیت کی جگہیں دیکھتے ہیں۔ ایک غیر ملکی جریدے کے مطابق:

> "۲۰۱۱-۲۰۱۰"ء کی عالمی رپورٹ کے مطابق دنیا میں سب سے زیادہ سیاح فرانس کا رُخ کرتے ہیں، صرف ۲۰۱۱ء میں تقریباً ۷ کروڑ ۹۵ لاکھ سیاحوں نے فرانس کی سیاحت کی اور سالانہ تقریباً ۳٪ کی شرح سے اِس تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے"۔[۲۶]

موجودہ عہد میں سیاحت بلاشبہ بڑی نفع بخش صنعت بن چکی ہے، ملکی زرِمبادلہ میں اضافے کے ساتھ ساتھ اِس صنعت نے بے شمار لوگوں کو روزگار بھی مہیا کر رکھا ہے۔ کئی لوگ تو براہِ راست سیاحت سے مستفید ہو جاتے ہیں جب کہ کئی سیاحت کی ترقی سے بالواسطہ طور پر بھی فائدہ اٹھاتے ہیں بس ضرورت اِس امر کی ہے کہ ملک میں سیاحتی سرگرمیوں کو فروغ دیا جائے اور ہر ممکن حد تک اِس صنعت کی افزائش کی جائے۔ سیاحت کے نفع بخش ہونے کا اندازہ سیاحت کے عالمی ادارے کی اِس سالانہ رپورٹ سے لگایا جا سکتا ہے:

> "عالمی سروے کے مطابق صرف سال ۲۰۱۱ء میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ نے سیاحت میں سالانہ ۱۱۶ ارب ڈالر سے زیادہ آمدن حاصل کی"۔[۲۷]

محمد اظہار الحق اپنے کالموں میں یہی مسئلہ بیان کرتے ہیں کہ ہم نااہل ہیں۔ اگر ہمارے اربابِ اختیار کچھ قابل ہوتے تو سیاحت سے کروڑوں کیا، اربوں کما سکتے تھے اور ہمارے ملک کا ذکر بالی، سوئٹزرلینڈ اور اُن یونانی

اور ہسپانوی جزیروں کے ساتھ ہوتا، جہاں سال کے بارہ ماہ، سیاحوں کا ہجوم رہتا ہے۔ لیکن سیاحت ایک انڈسٹری ہے اور انڈسٹری، سہولیات مانگتی ہے، مگر ہمارے نااہل حکمران سیاحوں کو کوئی بھی سہولت فراہم کرنے میں ناکام ہیں۔ اپنے کالم "جب پتھر بولیں گے، جب پانی بھڑکے گا" میں محمد اظہار الحق لکھتے ہیں:

> "دنیا کی تاریخ میں پاکستان جیسی نعمت کم ہی کسی کو ملی ہو گی اور کم ہی ایسا ہوا ہو گا جیسا اہلِ پاکستان نے اِس گراں قدر نعمت کی ناشکری کی ہے۔ طویل ساحل، بلوچستان کے قدرتی وسائل، سندھ کا صحرا اور پنجاب کے سونا اگلتے میدانوں کو تو الگ رکھیں، صرف شمالی علاقہ جات ہی پاکستان کو اوجِ ثریا تک لے جانے کے لیے کافی تھے۔ دو عشرے پہلے کی وہ رات نہیں بھولتی جب گلگت کے ایک ہوٹل میں کھانا کھاتے ہوئے ایک امریکی نے پوچھا تھا "کیا تم نے سوئٹزرلینڈ دیکھا ہے؟" میں نے نفی میں جواب دیا تو اُس نے بتایا کہ اُس نے دیکھ رکھا ہے اور ہُنزہ کسی شک اور شائبہ کے بغیر، سوئٹزرلینڈ سے زیادہ خوبصورت ہے"۔[۲۸]

محمد اظہار الحق اپنے کالموں میں ہمیں بتاتے رہتے ہیں کہ ہمارے ہم وطنوں کو پتہ ہی نہیں ہے کہ ہمارا وطنِ عزیز کس قدر خوبصورت اور حسین ہے، یہ پاک دھرتی اللہ پاک کا انمول عطیہ ہے۔ اِس میں بلند و بالا پہاڑ، فلک بوس برفانی چوٹیاں، زور و شور سے بہتے دریا، زرخیز میدان، نہری و بارانی علاقے، صحرا و جنگلات، جھیلیں اور سمندر سب کچھ موجود ہے۔ پھر ہر قسم کا موسم اور انواع و اقسام کے پھل اور فصلیں اللہ پاک نے ہمیں مہیا کر رکھی ہیں۔ محمد اظہار الحق مزید بتاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ پاکستانیوں کی اکثریت کو اندازہ ہی نہیں کہ ہمارے شمالی علاقہ جات میں کثرت سے پیدا ہونے والے پھلوں کا بڑا حصہ ضائع ہو رہا ہے۔ اگر آپ بلتستان، ہنزہ اور چترال کی سڑکوں پر چلیں تو کوسوں تک سڑک پر نہیں، خوبانیوں پر چلتے ہیں۔ سکردو اور کافرستان کی وادیوں خاص طور پر بمبریت میں پیدا ہونے والا آلو بخارا، مٹھاس میں اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ انگور اور آڑو کی پروسیسنگ اور محفوظ رکھنے کا ہمارے ہاں کوئی انتظام ہی نہیں ہے۔ ہمارے شمالی علاقوں کی سرحدوں سے چند کلو میٹر دور، ازبکستان اور تاجکستان میں یہی لینڈ سکیپ ہے اور اسی کے ساتھ کا علاقہ ہے لیکن ایک آڑو، ایک خوبانی اور

ایک چیری بھی ضائع نہیں ہونے دی جاتی اور جو پھل محفوظ (Tin Pack) ہونے سے بچ جاتے ہیں، اُن کا رس اور مربّہ بنا دیا جاتا ہے جو پورے وسط ایشیا میں کثرت سے فروخت اور استعمال ہوتا ہے۔ اپنے کالم "پہاڑ سر بن کا" میں محمد اظہار الحق ایبٹ آباد شہر کی منظر کشی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ایبٹ آباد کیا شہر ہے اور کیا اِس کی ہوا ہے۔ کیا محلِ وقوع ہے اور کیا کوہستانی حصار ہے جو قدرت نے اِس کے گرد کھینچا ہے۔ ایک طرف سر بن کا وہ پہاڑ ہے جس کے بارے میں اقبال نے اپنے قیامِ ایبٹ آباد کے دوران کہا تھا۔

اُٹھی پھر آج وہ پورب سے کالی کالی گھٹا

سیاہ پوش ہوا پھر پہاڑ سر بن کا

ہوا کے زور سے اُبھرا، بڑھا، اُڑا بادل

اُٹھی وہ اور گھٹا، لو، برس پڑا بادل

عجیب خیمہ ہے کُہسار کے نہالوں کا

یہیں قیام ہو وادی میں پھرنے والوں کا

دوسری طرف وہ راستہ ہے جو قراقرم کی طرف جاتا ہے اور دنیا کے خوبصورت ترین راستوں میں سے ہے۔ مانسہرہ، شنکیاری، ڈاڈر اور بٹل جاتے ہوئے احساس ہوتا ہے کہ قدرت نے پاکستان کے حق میں اپنی فیاضی کے دروازے پورے کھول دیے ہیں۔ میجر ایبٹ نے یونہی تو نہیں کہا تھا۔

I Remember the Day When I First Came Here

And Smelt the Sweet Abbottabad Air

نظم کے آخر میں ایبٹ رو کر کہتا ہے۔

I Bid You Fare Well With a Heavy Heart

Never From My Mind Will Your Memories Thwart

مگر آج خوبصورت ایبٹ آباد بے بسی کی تصویر ہے"۔[۲۹]

محمد اظہار الحق اپنی کالم نگاری میں بار بار اپنا یہ دکھ قارئین کے سامنے رکھتے ہیں کہ ہمارا وطنِ عزیز بلاشبہ بہت حسین ہے، اِس کے دلکش مناظر ایسے ہیں گویا کہ زمین پر جنت اُتر آئی ہو مگر ہماری بہت بڑی بد قسمتی ہے کہ جِن ملکوں کے پاس اِس حسن کا عشرِ عشیر بھی نہیں جو قدرت نے شمالی علاقوں کی شکل میں پاکستان کو دیا ہے، اُن ملکوں نے سیاحت سے پوری دنیا کو اپنی طرف کھینچ لیا ہے اور ہم اِس انتظار میں ہیں کہ آسمان سے فرشتے اتریں، ہماری سیاحت کی صنعت کو ترقی دیں اور پھر پلیٹ میں رکھ کر ہماری خدمت میں پیش کریں۔ ہمیں خوابِ غفلت سے جاگنا ہو گا اور اگر ہم حقیقت میں اپنے ملک میں سیاحت کی صنعت کا فروغ چاہتے ہیں تو ہمیں خلوصِ دِل سے اور پوری لگن سے کام کرنا ہو گا اور سیاحت کے شعبے کو ہر ممکن سہولیات فراہم کرتے ہوئے اِسے بامِ عروج تک پہنچانا ہو گا تبھی اِس صنعت سے ہم حسبِ خواہش نتائج حاصل کر سکیں گے۔

د)۔ محمد اظہار الحق کے کالموں میں معاشی اور سماجی مسائل پر نظر:

اقتصادیات یا معاشیات

جدید تعریف کے مطابق معاشیات سے مراد وہ سائنس ہے جو تبادلے سے متعلق قوانین کو کنٹرول کرتی ہے، دوسرے الفاظ میں اِس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ قوانین بنانے والے دولت کی منتقلی اور لین دین پر کنٹرول رکھتے ہیں۔ بقول ہنری جارج:

> "Economics is the Science which treats of the Laws which govern the Relations of Exchangeable Quantities." (Exchangeable Quantities means Wealth)۔[۳۰]

معاشیات معاشرتی علوم کی ایک اہم شاخ ہے، جِس میں مادی وسائل اور پیداوار کی تقسیم اور اُن کی طلب و رسد کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ عربی اور فارسی میں رائج اصطلاح اقتصادیات اردو میں معاشیات کے مترادف کے طور پر استعمال ہوتی ہے۔ معاشیات کی بہت سی شاخیں ہیں مگر مجموعی طور پر انھیں جزیاتی معاشیات (Microeconomics) اور کلیاتی معاشیات (Macroeconomics) میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ معاشیات

کی ایک اور تعریف کے مطابق قانون حقوق متعین کرتا ہے اور معاشیات حقوق کا تبادلہ طے کرتی ہے۔ معاشیات کی معروف کتاب تھیوری اینڈ پریکٹیکل آف بینکنگ کے مطابق:

"Law is the Science of Rights. Economics is the Science of the Exchanges of Rights."[۳۱]

انسان کی خواہشات بے شمار ہوتی ہیں لیکن اُنھیں پورا کرنے کے ذرائع تھوڑے ہوتے ہیں۔ لہذا انسان کو ہمیشہ سے یہ مسئلہ درپیش رہا ہے کہ وہ اپنی خواہشات کو دستیاب قلیل وسائل سے کیسے پورا کرے۔ گویا انسان کو بے شمار خواہشات میں انتخاب اور ذرائع میں کفایت کرنی پڑتی ہے۔ انسانی طرزِ عمل کے اِسی پہلو کے مطالعہ کا نام معاشیات ہے۔ حاجات کی کثرت اور وسائل کی قلت کے باعث دنیا کی بیشتر آبادی مسائل سے دوچار ہے، مثلاً غربت، جہالت، بیماری، قحط، بے روزگاری، مہنگائی اور افراطِ زر وغیرہ ہیں چنانچہ معاشی ماہرین اِن مسائل پر غور و فکر کرتے ہیں اور انھیں حل کرنے کے لیے معاشی منصوبہ بندی کرتے ہیں اور معاشی ترقی پر زور دیتے ہیں نیز اِس مقصد کے لیے ماہرینِ معاشیات ایسی تجویزیں پیش کرتے ہیں جن سے ملک میں اشیاء کی پیداوار بڑھے، زیادہ سے زیادہ لوگوں کو روزگار ملے اور لوگوں میں دولت کی تقسیم منصفانہ ہو، عوام میں خوش حالی کا معیار بلند ہو اور ان کی ضرورتیں زیادہ احسن طریقے سے پوری ہوں لہذا ضروری ہے کہ معاشیات کے جدید اصولوں اور نظریات سے فائدہ اٹھا کر اقتصادی ترقی کے لیے صدقِ دل سے کوشش کی جائے تاکہ اشیاء کی پیداوار بڑھے، زیادہ لوگوں کو روزگار ملے اور لوگوں کو ضرورت کی اشیاء سستی ملیں اور معاشرہ ترقی و خوش حالی کی طرف گامزن ہو۔ ضرورت اِس امر کی ہے کہ انسان کے معاشی مسئلہ کے مختلف پہلوؤں کو سامنے رکھتے ہوئے ایسا نظام بنایا جائے کہ کس طرح تمام انسانوں کو اُن کی ضروریاتِ زندگی بہم پہنچانے کا انتظام ہو اور کس طرح معاشرے میں ہر فرد اپنی قابلیت اور استعداد کے مطابق ترقی کر کے اپنی شخصیت کو نشوونما دینے اور اپنی لیاقت کو درجۂ کمال تک پہنچانے کے مواقع حاصل کرے۔ مثالی اور معیاری معاشی نظام کا بڑا مقصد یہ ہوتا ہے کہ معاشرے کے ہر فرد کو خواہ وہ بچہ ہو یا بوڑھا، عورت ہو کہ مرد بلا تفریق سب کو کم از کم اپنا سامانِ حیات ضرور دستیاب ہو جس کے بغیر عام طور پر ایک انسان اطمینان کے ساتھ زندہ نہیں رہ سکتا اور نہ ہی اپنے

فرائض وواجبات ٹھیک طرح سے ادا کر سکتا ہے جو مختلف حیثیت سے اس پر عائد ہوتے ہیں۔ معیشت کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ معاشرے کے ہر ایک فرد کے لیے کسی نہ کسی درجہ میں خوراک، لباس اور مکان کے علاوہ علاج، تعلیم اور روزگار کا مناسب انتظام ہو اور کوئی فرد اِن بنیادی ضروریات سے محروم نہ رہے اور یہی ایک اسلامی اور مثالی معاشرے کا مقصد ہے۔ اسلام نے ایک طرف زکوٰۃ فرض کر کے اور دوسری طرف رضاکارانہ طور پر صدقات، عطیات اور خیرات کی صورت میں دولت معاشرے میں پھیلانے کی تلقین کر کے سود (Intrest) پر کاری ضرب لگادی ہے۔ اسلامی معیشت میں نہ صرف دولت معاشرے میں پھیل جاتی ہے بلکہ لوگوں کے پاس پیسہ آجانے سے تجارت اور کاروبار میں بھی ترقی ہو جاتی ہے اور زیادہ لوگوں کو روزگار بھی مل جاتا ہے۔ آج جب دنیا بھر میں ہر طرف سودی لین دین چل رہا ہے ضرورت اِس امر کی ہے کہ ہم مسلمانوں کو، دوسرے لوگوں کو یہ باور کرانا چاہیے کہ اسلام کوئی ایسا مذہب یا عقائد کا فرسودہ نظام نہیں ہے جو کاروبار کے خلاف ہے۔ اسلام کے اخلاقی اصول کسی کو تجارت کرنے سے نہیں روکتے خود حضرت محمد ﷺ کا تعلق ایک کاروباری گھرانے سے تھا۔ اسلام نہ صرف آزادانہ کاروبار، نجی ملکیت کا حق اور دولت کے حصول کا موقع فراہم کرتا ہے بلکہ جائز طریقوں سے دولت کے فروغ کی بھرپور حوصلہ افزائی بھی کرتا ہے۔ خلیج ٹائمز کے مطابق:

> "آج کے پُر خطر اور پُر آشوب دور میں جب عالمی ذرائع ابلاغ تواتر کے ساتھ مصیبت زدہ معاشروں کی تصاویر اور بین الثقافتی جھگڑوں اور تشدد کی داستانوں کی بوچھاڑ کیے رکھتا ہے، ایسے میں مغرب اور مسلم دنیا کے کاروباری منصوبے ثقافتوں کے درمیان میں خلیج کو پاٹنے اور کاروباری منصوبے بنانے جیسا اہم کردار ادا کر سکتے ہیں، جو معاشروں کو ایک دوسرے سے دور ہٹانے کے بجائے قریب لانے کا باعث بنے گا"۔[۳۲]

سماجیات

دنیا میں ہر انسانی معاشرے کا وجود ٹھوس ثقافتی بنیادوں پر قائم ہے۔ انسان، معاشرہ اور ثقافت سب آپس میں لازم وملزوم ہیں، ہم ان کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کر سکتے۔ عام فہم انداز میں تو تمام انسانوں کا مجموعہ سماج کہلاتا ہے لیکن اگر کوئی یہ سوال اٹھانا شروع کر دے کہ انسان کیا ہے تو پھر انسان اور سماج دونوں کے وجود پر سوال اُٹھنا شروع ہو جاتے ہیں اور دونوں ہی پیچیدہ تر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ انسان صرف گوشت پوست کا لوتھڑا تو نہیں ہے بلکہ یہ ایک ایسا صاحبِ شعور اور صاحبِ نطق جانور ہے جو صرف ایک وجود کا نام نہیں ہے بلکہ اِس وجود کی بقا کے لیے درکار تمام مادی، جغرافیائی اور ماحولیاتی نظام کا نام بھی ہے۔ اِس تعریف کے مطابق کوئی بھی انسان اُس وقت تک مکمل انسان کہلا ہی نہیں سکتا جب تک اُسے اپنی بقا کے لیے معیاری و مناسب ماحول حاصل نہیں ہو جاتا۔ گروہ اور اجتماع اپنی سادہ شکل سے پیچیدہ شکل کی طرف سفر کرتے رہے ہیں اِس لیے یہ "مناسب" اور "معیاری" تقابلی صفات بھی ہوتی چلی گئیں۔ لوگوں کے تمام گروہ اور اجتماع کے ارتقائی مراحل سے گزرنے کے عمل کے دوران اور سماج کی موجودہ شکل تک سفر کے مراحل طے کرتے ہوئے یہ دونوں اصطلاحات اچھی خاصی "سیاسی" اصطلاحات بن گئی ہیں۔ انسان کا ارتقاء ایک تدریجی اور تاریخی عمل ہے، جو کئی صدیوں پر محیط ہے، انسان درجہ بدرجہ ترقی کر کے آج کی منظم معاشرتی زندگی تک پہنچا ہے۔ سماجیات کے لیے انگریزی میں لفظ (Sociology) مستعمل ہے، جس کی اصل لاطینی اور یونانی ہے۔ لاطینی لفظ "Socius" بہ معنی ساتھی، سنگتی اور یونانی لفظ "Logos" بہ معنی علم یا سخن یا بحث کے ہیں۔ سوشیالوجی کا متبادل لفظ عمرانیات عربی کے لفظ عمران سے نکلا ہے، جس کے معنی ہیں۔ آبادی، سماج، رہن سہن۔ سوشیالوجی کی اصطلاح کا سب سے پہلے فرانسیسی انشائیہ نگار عمانوئیل جوزف سیئیس (۱۷۴۸-۱۸۳۶) نے اپنے غیر مطبوعہ قلمی نسخے میں استعمال کیا۔ بعد ازاں فرانسیسی سائنسی فلسفی آگستے کومتے (۱۷۹۸-۱۸۵۷) نے ۱۸۳۸ء میں آزادانہ طور پر اِس کی تعریف وضع کی۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ چودھویں صدی عیسوی میں شمالی افریقی مسلمان دانشور ابنِ خلدون، علمِ عمرانیات کا باوا آدم ہے، اُس کی کتاب "مقدمہ ابنِ خلدون" سماجی ہم آہنگی اور سماجی تصادم کے بارے میں سماجی سائنسی استدلال سے کام لینے میں بڑا سنگِ میل ہے۔ آج کا انسان

سماجی حقوق حاصل کرنے کے لیے سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لیتا ہے کیونکہ بہتر سیاسی حالات ہی بہتر سماجی زندگی کی ضمانت فراہم کرتے ہیں۔ محمد اظہار الحق نے اپنی کالم نگاری میں معاشی اور سماجی پہلوؤں پر اکثر قلم اٹھایا ہے اور بہت کھل کر اِن موضوعات پر لکھا ہے۔ اپنے کالم "جن" میں وہ ہماری اقتصادی پالیسیوں اور حکومتی بجٹ پر طنز کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"بجٹ آیا تو میں نے اس کا تجزیہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے ہر ملنے والے سے بجٹ کے بارے میں پوچھا اور ہر ایک نے میری معلومات میں اضافہ کیا۔ مجھے ایک کام کے سلسلے میں ایک گاؤں جانا پڑا وہاں میری ملاقات تیرہ چودہ سال کے ایک لڑکے سے ہوئی۔ میں نے اُس سے پوچھا، "کیا تمھیں معلوم ہے کہ نیا بجٹ آچکا ہے؟"

"ہاں! میں نے اس کا ذکر سنا ہے۔ سکول میں ایک ٹیچر دوسرے کو بتا رہا تھا کہ اُس کی تنخواہ بڑھ جائے گی۔ مگر یہ بجٹ ہوتا کیا ہے؟" میں نے اُسے تفصیل سے بجٹ کے بارے میں بتایا، میں نے دیکھا کہ جوں جوں میں بجٹ کے بارے میں اُسے سمجھا رہا تھا، اُس کے چہرے پر ایک عجیب سی مسکراہٹ دیکھنے میں آ رہی تھی! اُس کی آنکھوں میں ایسی چمک جو کچھ غیر معمولی سی لگ رہی تھی، مزید تعجب اُس وقت ہوا جب وہ بولا تو اُس کی آواز بھاری اور پہلے سے یکسر مختلف تھی، جیسے اُس کے اندر سے کوئی اور بول رہا تھا۔ "تو تم اتنے دور سے مجھے بجٹ پڑھانے آئے ہو۔ کیا تم کوئی ایسا بجٹ لا سکتے ہو جو میرے گاؤں کے سکول کو ایک باعزت عمارت میں تبدیل کر سکے؟ کیا کوئی بجٹ میرے گھر کے صحن کو اور میری گلیوں کو پختہ کر سکتا ہے؟ کیا کوئی بجٹ ایسا ہو گا کہ میری ماں کو چولہے میں پھونکیں نہ مارنی پڑیں، میرے باپ کو اپنے علاج کے لیے ویگنوں اور بسوں کے ساتھ لٹک کر شہر نہ جانا پڑے اور کوئی ڈاکٹر گاؤں کے قریب ہی میسر ہو، کیا کوئی بجٹ ایسا ہو گا جو ایوانِ صدر اور ایوانِ وزیرِ اعظم کے اخراجات کے لیے اتنی رقم مختص کرے جتنی یورپی حکومتیں اپنے صدور اور وزرائے اعظم کی رہائش گاہوں کے لیے مختص کرتی ہیں؟ کتنے بجٹ آئے، کتنے سال گزرے،

کتنی بار خوابیدہ ارکان اسمبلی نے ہاتھ اٹھا کر بجٹ پاس کیے، میرے گاؤں کی سڑک، میرے گاؤں کے کچے گھر، میرے گاؤں کے بوڑھے، میرے گاؤں کے بچے، جس حال میں تھے، اُسی حال میں رہے! کیا میرا گاؤں پاکستان ہی کا حصہ ہے؟ یا صرف بڑے بڑے شہر ہی اِس ملک کی پہچان ہیں؟"[۳۳]

محمد اظہار الحق نے ڈھاکہ یونیورسٹی سے معاشیات میں ماسٹر ڈگری حاصل کر رکھی ہے، اِس لیے ملک کے معاشی معاملات کو دیگر کالم نگاروں اور صحافیوں کی نسبت وہ بہتر انداز میں سمجھتے ہیں اور اُن پر جامع تبصرہ کر سکتے ہیں، محمد اظہار الحق اپنے کالم "چراغ" میں لکھتے ہیں:

"پاکستان کے چوٹی کے ماہرِ معاشیات محمد اکرم خان اقتصادیات کے شعبے میں بین الاقوامی شہرت رکھنے والے عالم ہیں۔ اُن کی تصنیف

"What is wrong with Islamic Economics"

اپنے موضوع پر ایک جامع اور بے مثال تحقیق ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ اسلامی معاشیات کے حوالے سے علم کا خزانہ ہے تو مبالغہ نہ ہو گا۔ مصنف بغیر کسی تعصب کے، بغیر کسی طے شدہ نتیجہ کے، اسلامی اکنامکس، رِبا، اسلامی بینکنگ، اسلامی مالیات، زکوٰۃ اور دوسرے متعلقات پر بے لاگ محاکمہ کرتے جاتے ہیں۔ وہ نہ روایتی علماء کے نکتۂ نظر سے مطمئن ہیں اور نہ ہی رِبا کی "مقبولِ عام" کرنے والے جدت پسندوں سے اتفاق کرتے ہیں۔ وہ مثالوں سے ثابت کرتے ہیں کہ اسلامی اقتصادیات پر کام سائنسی بنیادوں پر نہیں کیا جا سکا۔ محمد اکرم خان کی اِس کتاب کا دنیا بھر کے "اسلامی اقتصادیات" کے سنجیدہ طالب علم مطالعہ کر رہے ہیں۔ اِس پر تبصرے کیے جا رہے ہیں۔ ریویو شائع کیے جا رہے ہیں۔ ضرورت اِس امر کی ہے کہ اِس کا اردو زبان میں ترجمہ کیا جائے تا کہ سنجیدہ پاکستانی علماء اور سکالر بھی اِس تک رسائی حاصل کر سکیں اور مصنف سے اتفاق یا اختلاف کر سکیں۔ یاد رہے کہ اِس قبیل کے مسائل میں

اختلاف ناگزیر ہے اور آگے بڑھنے کے لیے اختلاف رکاوٹ نہیں بنتا، سیڑھی کا کام دیتا ہے"۔[۳۴]

محمد اظہار الحق کی کالم نگاری سے امید اور حوصلہ مندی کا درس ملتا ہے، انھوں نے اپنے قارئین کو ہمیشہ مثبت سوچ فراہم کی ہے، وُہ ملکی معاشی حالات کی بہتری کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ معاشی میدان کے مختلف پہلوؤں پر اُن کی بڑی گہری نظر ہوتی ہے اور وُہ دل سے خواہش رکھتے ہیں کہ عام آدمی بہتر زندگی سے مستفید ہو اور اُسے لازمی ضروریاتِ زندگی کی آسان اور یقینی فراہمی ممکن ہو سکے۔ انھوں نے اپنے صحافتی فرائض پوری ذمہ داری اور غیر جانبداری کے ساتھ پورے کیے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں جہاں کہیں بھی انقلاب یا جنگ کے حالات پیدا ہوئے وہاں صحافت نے نمایاں اور اہم کردار ادا کیا ہے اور ہنوز کر رہا ہے۔ بقول عبد الحئ:

> "پہلی جنگِ عظیم ہو یا ہندوستان کی تحریکِ آزادی، قومی اور بین الاقوامی دونوں سطح پر صحافت نے گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔ اگر آج کے دور کی بات کریں تو صحافت اب ہماری زندگی کا لازمی جزو بن چکی ہے۔ ہمیں صبح جاگنے کے بعد سب سے پہلے اخبار یاد آتا ہے اُس کے بعد دوسری ضروریات۔ آج صحافت کا پیشہ بھی اہم اور معزز پیشوں میں شمار کیا جاتا ہے اور صحافی کو بہت زیادہ عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ صحافت ایک عظیم مشن ہے اور اِس مشن میں غیر جانبدار ہو کر ہی بہتر طور پر کام کیا جاسکتا ہے اور اِس مشن کو آگے بڑھایا جاسکتا ہے"۔[۳۵]

محمد اظہار الحق معاشی ترقی کے ساتھ ساتھ سماجی روابط اور معاشرتی مسائل پر بھی اکثر قلم اٹھاتے رہتے ہیں، انھوں نے رشتوں کے تقدس اور احترامِ آدمیت پر بہت کچھ لکھا ہے۔ اپنے کالم "ایک عجیب غم" میں وہ اپنی والدہ کی وفات کو بیان کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ اولاد کے لیے والدین اور خصوصاً ماں کی ذات کتنی مبارک اور قیمتی ہوتی ہے۔ وہ اِس بات پر دکھ کا اظہار کرتے ہیں کہ اولاد اگر ساری زندگی بھی لگی رہے تو والدین کا حق پوری طرح ادا نہیں کر سکتی ہے۔ اسی کالم "ایک عجیب غم" میں وہ لکھتے ہیں:

"قدرت کی عجیب بے نیازی ہے کہ ادھر تو ماں باپ کو اتنا درجہ عطا کیا کہ اپنی ربوبیت تک میں شریک کر لیا اور تشکر میں بھی اپنے ساتھ ملا لیا۔ خود ہی حکم دیا کہ " میرا شکر ادا کر اور اپنے والدین کا " لیکن دوسری طرف اُنھیں اتنا نازک اور فانی بنایا کہ اولاد کے دیکھتے دیکھتے وہ چل بستے ہیں اور اولاد پیغمبر ہو یا ولی، بادشاہ ہو یا پہلوان، کفِ افسوس ملنے اور عمر بھر کی نوحہ خوانی اور اشک فشانی کے سوا کچھ بھی نہیں کر سکتی۔ ہم جیسے بے بضاعت اور بیان و تحریر میں عاجز تو نوحہ خوانی کا حق بھی نہیں ادا کر سکتے "۔[۳۶]

ماں باپ تو سایہ دار درخت کی طرح ہوتے ہیں جو ہر کٹھن گھڑی میں، آزمائش کی تپتی دھوپ میں گھنا سایہ بن کر اولاد کو ٹھنڈی چھاؤں فراہم کرتے ہیں۔ جیسے ہی یہ سایہ دار درخت انسان کی زندگی سے غائب ہوتا ہے۔ یہ طلسمی مافوق الفطرت خوبصورت پرندے انسان کی زندگی سے رخصت ہو جاتے ہیں، دوسری دنیاؤں سے اُس کے رابطے ٹوٹ جاتے ہیں پھر اُسے ان ساری سختیوں اور بے مہریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے جو اِس دنیا سے مختص ہیں۔ کڑکتی دھوپ، شل کرتے جاڑے، کوڑوں کی طرح ضربیں لگاتے جھکڑ، غیروں کی دشمنیاں، اپنوں کی منافقتیں اور انسان چیخ اٹھتا ہے:

؎ یہ زندگی کے کڑے کوس، یاد آتا ہے

تری نگاہِ کرم کا گھنا گھنا سایہ

محمد اظہار الحق کالم "ایک تصویر دیکھ کر" میں والدین کے بڑھاپے کا ذکر کچھ یوں کرتے ہیں:

"اور پھر۔۔۔ ایک اور گتھی۔۔۔ جو آج تک سلجھ نہیں سکی کہ ماں باپ بوڑھے کیوں ہو جاتے ہیں ؟ یہ حقیقت کتنی دردناک ہے کہ انسان کے کٹھن وقت میں جن دو ہستیوں نے اُس کی دست گیری کی، اُس کے منہ میں پانی اور دودھ کے قطرے ٹپکائے، اُسے غلاظتوں سے پاک کیا۔ اُسے موسموں کی سختیوں سے بچایا، وہ دو ہستیاں ، قدرتِ خداوندی اور ربوبیت کی مظہر دو ہستیاں خود بوڑھی ہو گئیں۔ ان کے قویٰ

مضمحل ہو گئے۔ان کی نظریں کمزور ہو گئیں۔ان کے چہرے جھریوں سے لٹ گئے۔ان کی یاداشتیں مدھم پڑ گئیں۔ان کے اعصاب پر ضعف طاری ہو گیا۔ آخر کیوں۔۔۔؟

کیا کوئی تکلیف ماں باپ کے بڑھاپے اور ضعف اور رقتِ قلب اور تنہائی اور کم خوری سے زیادہ بھی دل کو مٹھی میں جکڑنے والی اور روح کو قرب میں ڈالنے والی ہو سکتی ہے ؟ آہ!جو مضبوط میاں بیوی بے کسی اور بے چارگی میں ہماری دست گیری کرتے رہے اُن پر آہستہ آہستہ چھاجانے والے بڑھاپے کے سامنے ہم بے بس ہو جاتے ہیں!"[۳۷]

کالم نگاری کے بارے میں عام تاثر یہی ہے کہ چونکہ کالم روزانہ کی بنیاد پر اور عجلت میں لکھے جاتے ہیں اِس لیے اِن میں معیاری ادب تخلیق نہیں ہو پاتا، میتھیو آرنلڈ نے اسی وجہ سے صحافت کو جلدی میں لکھا ہوا ادب قرار دیا ہے۔ "Journalism is a literature in hurry." مگر جارج برنارڈ شا تمام اعلیٰ ادب کو صحافت کا درجہ دیتے ہیں۔ جیسا کہ ڈاکٹر محمد شاہد حسین اپنی کتاب "ابلاغیات" میں لکھتے ہیں:

"ہو سکتا ہے کہ میتھیو آرنلڈ کی تعریف بہت سے لوگوں کے لیے قابلِ قبول نہ ہو۔کیونکہ لفظ عجلت میں پوشیدہ تحقیری عنصر بالکل پوشیدہ بھی نہیں۔اور اس امکان سے یکسر انکار نہیں کیا جا سکتا کہ عجلت میں لکھی گئی تحریریں بھی معیاری ہو سکتی ہیں"۔ [۳۸]

محمد اظہار الحق کی تحریروں کا شمار بھی بلاشبہ ایسی ہی تحریروں میں کیا جا سکتا ہے، جو روزانہ کی بنیاد پر اور عجلت میں لکھی ضرور جاتی ہیں۔ مگر، معیاری ادب کے زمرے میں شامل ہونے کا درجہ رکھتی ہیں۔ یہ تحریریں معاشرے کے لیے اصلاحی بھی ہوتی ہیں اور حد درجہ سبق آموز بھی۔ محمد اظہار الحق اپنے کالموں میں نوجوان نسل کو بار بار یہ درس دیتے نظر آتے ہیں کہ اللہ کے بندو! تم میں سے جن کے ماں باپ سلامت ہیں، ان کی قدر کرو، خدا را جنت کا یہ ٹکٹ اپنے ہاتھ سے نہ گنواؤ، اگر وہ ناراض ہیں تو اُن کو لازمی طور پر راضی کر لو، اپنی مکروہ انا کو جھٹک کر اُن کے مقدس پیروں پر اپنے سر رکھ دو، ان کے کانپتے ہاتھوں پر اپنا چہرہ جھکا دو، انھیں خود کھانا کھلاؤ اور اُن کی ہر ممکن خدمت کرو، وقت اُڑ رہا ہے، کہیں زندگی بھر کا پچھتاوا تمھارے لیے جلتا تنور نہ بن

جائے۔ المیہ یہی ہے کہ جن کے ماں باپ زندہ ہیں، انھیں اکثر و بیشتر احساس ہی نہیں ہوتا کہ وہ کتنے خوش بخت ہیں! پیدائش سے ساتھ دیکھ کر، ہم انھیں اپنے وجود، اپنے ماحول کا حصہ سمجھ لیتے ہیں، وقت گزرتا جاتا ہے، پھر وہ کمزور اور ضعیف ہونے لگتے ہیں، ایسے میں اولاد کو اور زیادہ اُن کا خیال رکھنا چاہیے، پہلے سے بڑھ کے اُن کی خدمت اور دیکھ بھال کرنی چاہیے، مگر اِس کے برعکس ہی ہوتا ہے۔ محمد اظہار الحق کالم "اس عید پر" میں لکھتے ہیں:

> "افسوس! آدم کی اولاد کو جتنی محبت اپنی اولاد اور اولاد کی اولاد سے ہے، اتنی ماں باپ سے نہیں! اِس صورتِ حال کا علم پیدا کرنے والے کو تھا، اسی لیے تو وارننگ دی کہ والدین اگر بوڑھے ہو جائیں تو اُف نہ کرو، درشتی سے جواب نہ دو۔ عجز سے بازو پھیلائے رکھو، یہ کہیں نہیں فرمایا کہ بچوں کا خیال رکھو کہ وہ ہاتھ سے مکھی بھی نہیں اڑا سکتے! بچے کے لیے ماں بھی جاگتی ہے، پیشاب پاخانہ سنبھالتی ہے، باپ بھی ہر وقت بچھنے کے لیے تیار ہے، پھر جب وہ ڈیڑھ فٹ کا بے بس بچہ کڑیل جوان بنتا ہے تو سمجھتا ہے کہ وہ ہمیشہ سے گبھرو تھا، پھر وہ بات بات پر بگڑتا ہے، اونچی آواز سے بولتا ہے، گستاخی کرتا ہے، اُن کی دل آزاری کرتا ہے، اُن کے آرام کا، ضروریات کا خیال نہیں رکھتا، اُن دو ہستیوں کو بھول جاتا ہے، جنھوں نے بچپن سے جوانی تک اُس کی پل پل بے لوث خدمت کی ہوتی ہے، اولاد تو اپنے والدین کی ایک دن کی خدمت کا بدلہ تک نہیں دے سکتی، عمر بھر کی ریاضتوں کا قرض بھلا کیسے چکا سکتا ہے۔ اولاد والدین کی نافرمانی کرتے ہوئے یہ کیوں بھول جاتی ہے کہ وہ آج جو بو رہا ہے، کل وہی کچھ کاٹے گا۔ ہے نا انسان خسارے میں! اپنے ہاتھوں سے اپنے لیے کنواں کھودتا انسان!!"[۳۹]

بچہ جب جوان ہو جاتا ہے تب اسے احساس ہوتا ہے کہ اس کے ماں باپ اس سے بے پناہ محبت کرتے ہیں۔ انھوں نے اُسے اس وقت سنبھالا جب وہ چہرے سے مکھی تک نہیں ہٹا سکتا تھا، وہ اس کے لیے راتوں کو جاگے۔ دن کا آرام حرام کیا اور اپنا مال، وقت، جان سب کچھ اس کے لیے وقف کر دیا۔ لیکن اُسے ان کی محبت

کا پوری طرح سے ادراک نہ ہو سکا اُس نے اُن کی نافرمانی ہی کی اور اُن سے تغافل برتا۔ اُن کی باتوں کو جو زندگی بھر کے تجربات کا نچوڑ تھیں، ایک کان سے سنا اور دوسرے سے نکال دیا، وہ اُس کی جدائی میں تڑپے تو اُس نے پرواہ نہ کی اور اُس کی تکلیف پر آنسو بہائے تو اُن کے انمول آنسوؤں کی قدر نہ کی۔ یہاں تک کہ وہ خود باپ بنا اور اُسے احساس ہوا کہ باپ اپنی اولاد سے کس قدر محبت کرتا ہے۔ جب وہ دھوپ میں تھا اور اُسے باپ نے سائے میں آجانے کے لیے کہا تو وہ نہ مانا لیکن جب اُس کے اپنے بیٹے کو دھوپ میں کھڑا کیا گیا تو وہ کرب سے چلا اٹھا، تب اسے اُن ساری باتوں پر یقین آیا جو اُس کے ماں باپ نے کی تھیں اور وہ سارے آنسو موتی لگے جو ماں باپ نے اُس کے لیے بہائے تھے۔ ماں باپ کا اولاد سے بہت ہی پیارا اور اٹوٹ رشتہ ہوتا ہے۔ بیٹی بھی اِسی خوبصورت رشتے کے ایک کڑی ہوتی ہے۔ محمد اظہار الحق نے کالم "رخصتی" میں بیٹی کی پیاری ذات کے بارے میں اپنا قلم اٹھایا ہے۔

وہ لکھتے ہیں:

> "یہ معاشرہ بیٹی کے ضمن میں عجیب تضادات کا شکار ہے۔ ان پڑھ تو خیر ان پڑھ ہیں، بڑے بڑے تعلیم یافتہ بھی بیٹی کو بیٹے سے کم تر سمجھتے ہیں، کیا کلف دار طرے اور عبائیں اور کیا تھری پیس سوٹ اور تسموں والے بوٹ، غالب اکثریت بیٹی کو جائیداد سے محروم رکھتی ہے۔ عورتوں کے حقوق کے لیے کام کرنے والی بہت سی تنظیمیں بھی اِس سماجی برائی پر توجہ نہیں دے رہیں بلکہ اگر اعداد و شمار اکھٹے کیے جائیں تو معلوم ہو گا کہ سوشل ورک کرنے والی بہت سی ماڈرن خواتین نے خود اپنی بیٹیوں کو شرعی اور قانونی وراثت سے محروم کر رکھا ہے۔ کاروکاری اور ونی جیسی ظالمانہ رسموں کا وحشیانہ کاروبار جاری ہے۔ عدالتوں کی موجودگی میں پنچائتیں دن دہاڑے عورتوں کی بے حرمتی کا فیصلہ کرتی ہیں اور آسمان سے پتھر برستے ہیں نہ زمین پھٹتی ہے"۔[۴۰]

محمد اظہار الحق معاشرے میں موجود ایسے کئی سماجی مسائل کو اپنے کالموں میں قارئین کے سامنے اجاگر کرتے رہتے ہیں، چاہے وہ بیٹیوں کے ساتھ روا رکھا جانے والا امتیازی سلوک ہو، کاروکاری یا ونی جیسی گھناؤنی رسمیں ہوں، ہمارے عدالتی نظام کی خرابی ہو یا انصاف کی عدم فراہمی، رشتوں کی ناقدری ہو یا دولت کی ہوس، لسانی تعصبات ہوں یا معاشرتی اقدار کی تنزلی، اخلاقی پستی ہو یا سماجی بے راہ روی۔ محمد اظہار الحق نے روزمرہ زندگی اور عوامی دلچسپی کے عام موضوعات پر لکھا ہے اور جس موضوع پر قلم اٹھایا ہے، اپنی علمی و صحافتی مہارت سے اُسے خاص بنا دیا ہے۔ محمد اظہار الحق نے اپنی کالم نگاری میں اِس فرمانِ مصطفےٰ ﷺ پر مِن و عن عمل کیا ہے۔

"سب سے افضل جہاد ظالم حکمران کے سامنے انصاف یا حق کی بات کہنا ہے"۔ [۴۱]

محمد اظہار الحق مذہبی گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں اِس لیے مذہب سے پیار اُن کی رگ رگ میں بسا ہوا ہے، اپنے مذہب سے اِس پیار کا اظہار وُہ اپنے کالموں میں کئی جگہ کرتے نظر آتے ہیں۔ انھوں نے کبھی اپنے ضمیر کے خلاف کچھ نہیں لکھا، انھوں نے جو کچھ سچ سمجھا، وہی کچھ لکھا۔ اُن کی کالم نگاری کا وصف یہ ہے کہ انھوں نے کبھی کسی فرد کی خوشنودی کے خیال سے کچھ نہیں لکھا، چاہے وہ اپنے وقت کا حاکم ہی کیوں نہ ہو۔ محمد اظہار الحق نے اپنی غیر جانب داری، حق گوئی اور بے باکی کا عملی مظاہرہ کرنے کے لیے یہ فرمانِ مصطفےٰ ﷺ کافی سمجھا:

"جس نے کسی حاکم کو راضی کرنے کے لیے وُہ بات کی جو اُس کے رب کو ناراض کر دے، وُہ اللہ کے دین سے نکل گیا"۔ [۴۲]

اسی وجہ سے محمد اظہار الحق کے کالم عام فہم اور حقیقت سے قریب ہونے کی وجہ سے قارئین میں پسند کیے جاتے ہیں۔ محمد اظہار الحق نے سلگتے معاشرتی مسائل اور مسلمانوں کی پست اخلاقی حالت پر اکثر کالموں میں کچھ نہ کچھ لازمی لکھا ہے۔ اپنے کالم "کافر بھارت" میں وہ پیر پرست طبقے کی جہالت، ضعیف الاعتقادی اور توہم پرستی پر افسوس کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"پہلا واقعہ اُس بدبخت جاہل شوہر کا ہے جس نے اپنی بیوی کو اپنے ہاتھوں فائرنگ کر کے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ قصور بیوی کا یہ تھا کہ وہ بیٹا پیدا نہیں کر رہی تھی۔ یکے

بعد دیگرے اُس نے چار بیٹیاں جنم دے دیں۔ پہلی بیٹی کی پیدائش کے بعد ہی شوہر نے بیوی پر تشدد کرنا شروع کر دیا۔ پھر ہر بیٹی کی پیدائش پر یہ تشدد بڑھتا گیا۔ جس روز کا یہ واقعہ ہے اُس دن بیوی نے گھر کے لیے خرچہ مانگا۔ شوہر نے پہلے تو اُسے زدو کوب کیا اور پھر فائرنگ کر کے ہلاک کر دیا۔ یہ واقعہ شیخوپورہ میں پیش آیا۔ دوسرا واقعہ اِس سے بھی زیادہ دردناک اور باعثِ عبرت ہے۔ ایک عورت نے اپنے ہاتھوں سے اپنی دو بیٹیوں اور ایک بیٹے کو نہر میں گرا کر ڈبو دیا۔ ایک بیٹی چار سال کی تھی۔ دوسری سات سال کی تھی۔ بیٹا آٹھ سال کا تھا۔ وہ تو بارہ سالہ بڑے بیٹے کی قسمت اچھی تھی کہ وہ سکول گیا ہوا تھا اور بچ گیا۔ لاہور کی بی آر بی نہر میں مسلمان عورت نے اپنے تین بچوں کو ڈبو کر مار دیا، اُسے ایسا کرنے کی ہدایت اُس کے پیر، بابا سوہنے شاہ نے کی تھی۔ ہمارے اسلامی ملک میں ہر شہر، ہر قصبے کی ہر گلی میں، ہر ڈھوک، ہر گوٹھ میں، سوہنے شاہ بیٹھے ہیں۔ ان کی ہدایات پر عمل پیرا ہو کر کبھی کوئی "مسلمان" آدھی رات کو قبر کھول کر مردے کا پیٹ چاک کر رہا ہوتا ہے، کبھی کوئی اپنے بچے کے گلے پر چھری پھیر دیتا ہے اور کبھی کوئی عورت اپنے لخت ہائے جگر کو بپھرتی موجوں کی نذر کر دیتی ہے۔ اِس اسلامی ملک کے وزرائے اعظم پیٹھ پر چھڑیاں مرواتے ہیں۔ منتخب نمائندے اپنے دن کا آغاز پامسٹوں کے پاس حاضر ہو کر کرتے ہیں۔ "پڑھی لکھی" آبادی کی اکثریت ایک دوسرے سے ملاقات کے وقت پہلے پوچھتی ہے کہ آپ کا سٹار کون سا ہے؟ پھر سارے مشاغل، سارے پلان، سارے ارادے اُس سٹار کے گرد گھومتے ہیں"۔[۴۳]

محمد اظہار الحق اسی لیے مسلمانوں کی بے علمی اور بے عملی پر کڑھتے نظر آتے ہیں کہ دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے اور ہم مسلمان ابھی تک توہمات کا شکار ہیں۔ ہماری ضعیف الاعتقادی کا یہ عالم ہے کہ ہم سٹارز پر یقین رکھتے ہیں، جدوجہد اور عمل سے کوسوں دور ہیں۔ اللہ پاک ہم مسلمانوں کی حالتِ زار پر رحم فرمائے اور ہمیں بے عملی کے چنگل سے رہائی ملے اور ہم محنت کی عظمت سے صحیح معنوں میں فیضیاب ہو سکیں۔

محمد اظہار الحق ہر قسم کے تعصبات کے خلاف ہیں۔ اُنھوں نے اپنے اکثر کالموں میں حب الوطنی اور مساوات کا درس دیا ہے۔ کالم "نہیں! ڈاکٹر قدیر خان صاحب! نہیں" میں اپنے انھی خیالات کا اظہار کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

> "اہلِ پاکستان میں سو برائیاں سہی، ہزار کمزوریاں سہی، مگر ایک گناہ کا طعنہ انھیں نہیں دیا جا سکتا اور وہ ہے لسانی تعصب! لسانی تعصب نہ ہونے کا ثبوت صرف اہلِ پاکستان ہی میں نہیں، تاریخِ پاکستان میں بھی روزِ روشن کی طرح موجود ہے۔ غلام رسول مہر کی تحریکِ مجاہدین کی تاریخ میں بالاکوٹ کے شہداء کے اسمائے گرامی دیکھ لیجیے، یوپی اور بہار کے مجاہدین کے شانہ بشانہ سندھ، پنجاب اور سرحد کے غازی لڑ رہے تھے۔ خود تحریکِ پاکستان اس حقیقت کا بین ثبوت ہے کہ برصغیر کے مسلمانوں نے الحمد للہ لسانی تعصب سے ہمیشہ اپنا دامن بچا کر رکھا۔ یہ جو ڈاکٹر عبد القدیر خان صاحب نے کہا ہے کہ "میرے ساتھ زبان کی بنیاد پر زیادتی کی گئی ہے" تو اِس قوم کے دل پر زخم لگایا ہے کہ مدتوں رِستا رہے گا۔ تلوار کا زخم بھر جاتا ہے لیکن "زبان" کا زخم؟ اور پھر زبان کا وہ زخم جو زبان کے حوالے سے ہے!"[۴۴]

محمد اظہار الحق نے اصولوں کی صحافت کی ہے، انھوں نے صحافت کے درخشاں اصولوں پر کاربند رہ کر صحافت میں اپنا رُخ متعین کیا اور غیر جانب دارانہ اور بے باک صحافت میں اپنی پہچان بنائی ہے اور سنجیدہ صحافتی حلقوں میں نام کمایا ہے، ہم موجودہ دور کو بلاشبہ محمد اظہار الحق کی بے مثال صحافت کا سنہری دور کہہ سکتے ہیں، آج کئی نئے لکھنے والے صحافی اور اخبار نویس محمد اظہار الحق کے مثالی صحافتی اصولوں پر عمل پیرا ہو کر اردو صحافت کے میدان میں اپنی کامیابیوں کے جھنڈے گاڑ رہے ہیں۔ محمد اظہار الحق اردو کالم نگاری میں اپنے منفرد اظہار کے حوالے سے ایک جداگانہ و برتر مقام کے حامل ہیں۔ محمد اظہار الحق کی کالم نگاری کی خوبی کردار سازی ہے۔ وہ بخوبی جانتے ہیں کہ معاشرتی اور اجتماعی تعمیرِ نو میں افراد کی اخلاقی بالیدگی اور بلند کرداری کو بنیادی اہمیت حاصل ہے چنانچہ اسلام کی اعلیٰ اخلاقی اور روحانی اقدار کے انسانی سیرت و کردار میں ڈھلنے کی آرزو اُن کی کالم نگاری

میں مسلسل سامنے آتی رہتی ہے۔اُن کی کالم نگاری کی عوامی سطح پر بھرپور پذیرائی کی ایک وجہ،اُن کی طرف سے اپنی بات کو کہانی کے انداز میں دلچسپ پیرائے اور مؤثر طریقے سے کہنا،عام آدمی کے دکھ سکھ کو موضوع بنانا اور زندگی اور معاشرے کی تلخ حقیقتوں کو کھل کر بیان کرنا بھی ہے۔اُن کی کالم نگاری کی بڑی انفرادیت یہ بھی ہے کہ انھوں نے کالم نگاری کے میدان میں اپنی الگ دنیابسائی ہے،یہ دنیااپنی سادگی،تازگی،اپنے مناظر، اپنے رنگوں، اپنی فضاؤں، اپنی ہواؤں، اپنے وقوعوں اور اپنی خوشبوؤں ہر لحاظ سے دوسروں سے الگ اور منفرد ہے۔ محمد اظہار الحق نے اپنے من کی دنیامیں ڈوب کر کالم نگاری کی ہے،اِس لیے اُن کے ہر لفظ و ہر سطر میں تاثیر ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ سے دعاہے کہ کالم نگاری کے میدان میں اُن کے بیان کی سادگی و تازگی ہمیشہ برقرار رہے اور وہ اپنے قارئین کے دلوں اور ذہنوں پہ راج کرتے رہیں اور معیاری ادب تخلیق کر کے اردو ادب کا دامن قیمتی ادبی اثاثے سے بھرتے رہیں۔(آمین)

حوالہ جات

۱۔ پروفیسر عمر زبیری، قدیم تہذیبیں اور مذاہب، طیب شمشاد پرنٹرز، لاہور، ۲۰۱۲ء، ص ۱۹

۲۔NCSS Task Force on standards for teaching & learning in the social studies,1993,P 213

۳۔ فریڈرک کوپلسٹن، اے ہسٹری آف فلاسفی، ماڈرن فلاسفی ۱۹۷۴ء، ص ۹

۴۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، جلد ۳، ۱۹۶۷ء، ص ۴۲۰

۵۔ حصار، ۱۹۸۷ء، ص ۱۱

۶۔E.B Tylor researches into the development of mythology, Newyork,Gordon ۔Philosophy religion art and custom.

ISBN Press 1974.

۷۔ محمد اظہار الحق، تلخ نوائی (کالم) "پانچ بیماریاں" المیزان پبلشرز، الکریم مارکیٹ، اردو بازار لاہور، ۲۰۱۶ء، ص ۲۲۱۔۲۱۹

۸۔ محمد اظہار الحق، تلخ نوائی (کالم) "پہلا سورج" المیزان پبلشرز، الکریم مارکیٹ، اردو بازار لاہور، ۲۰۱۶ء، ص ۱۸۴

۹۔ محمد اظہار الحق، تلخ نوائی (کالم) "نیا سال" المیزان پبلشرز، الکریم مارکیٹ، اردو بازار لاہور، ۲۰۱۶ء، ص ۱۸۸۔۱۸۶

۱۰۔ عبد السلام خورشید، ڈاکٹر، اردو صحافت پاک و ہند میں، انجمن ترقی اردو، کراچی، ۱۹۶۶ء، ص ۱۰۔۹

۱۱۔ محمد اظہار الحق، تلخ نوائی (کالم) "میں پرتھ یونیورسٹی سے متاثر کیوں نہیں ہوا؟" المیزان پبلشرز، الکریم مارکیٹ، اردو بازار لاہور، ۲۰۱۶ء، ص ۲۰۲

۱۲۔ محمد اظہار الحق، تلخ نوائی (کالم) "مگر اک بات، جو دل میں تھی، جس کا غم بہت ہے" المیزان پبلشرز، الکریم مارکیٹ، اردو بازار لاہور، ۲۰۱۶ء، ص ۱۶۵

۱۳۔ محمد اظہار الحق، تلخ نوائی (کالم) "مگر اک بات، جو دل میں تھی، جس کا غم بہت ہے" المیزان پبلشرز، الکریم مارکیٹ، اردو بازار لاہور، ۲۰۱۶ء، ص ۱۶۷۔۱۶۶

۱۴۔ محمد اظہار الحق، تلخ نوائی (کالم) "فحاشی کی تعریف" المیزان پبلشرز، الکریم مارکیٹ، اردو بازار لاہور، ۲۰۱۶ء، ص ۱۱۸

۱۵۔ جاوید چودھری، "زیرو پوائنٹ" عبداللہ اکیڈمی، لاہور، ۲۰۰۹ء، ص ۵۳

۱۶۔ پروفیسر محمد شاہد حسین، ابلاغیات، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۳ء، ص ۴۵

۱۷۔ روزنامہ "امروز" لاہور، ۲۶ اکتوبر، ۱۹۶۸ء

۱۸۔ ابو عبداللہ محمد بن اسماعیل بخاری، صحیح بخاری، باب اللہ تعالیٰ نے سورۃ نساء میں فرمایا، بخارا، ۲۳۳ھ، ۸۴۷ء حدیث نمبر ۷۱۳۸

۱۹۔ محمد اظہار الحق، تلخ نوائی (کالم) "کیا ہمارے ڈاکٹر۔۔۔؟" المیزان پبلشرز، الکریم مارکیٹ، اردو بازار لاہور، ۲۰۱۶ء، ص ۱۶۳۔۱۶۰

۲۰۔ محمد اظہار الحق، تلخ نوائی (کالم) "نظر نہ آنے والا نظام" المیزان پبلشرز، الکریم مارکیٹ، اردو بازار لاہور، ۲۰۱۶ء، ص ۲۶۰۔۲۵۸

۲۱۔ پروفیسر محمد حنیف شاہد، اسلام اور قائداعظم، ٹیکنیکل پبلشرز، اردو بازار، لاہور، ۲۰۱۰ء، ص ۷۲

۲۲۔ محمد اظہار الحق، تلخ نوائی (کالم) "واہ پاکستان! تیری بھی کیا قسمت ہے!" المیزان پبلشرز، الکریم مارکیٹ، اردو بازار لاہور، ۲۰۱۶ء، ص ۱۰۱

۲۳۔ محمد اظہار الحق، تلخ نوائی (کالم) "احمقانہ سوالات" المیزان پبلشرز، الکریم مارکیٹ، اردو بازار لاہور، ۲۰۱۶ء، ص ۲۶۲

۲۴۔ روزنامہ "جنگ" راولپنڈی، مورخہ ۲۰ جنوری ۱۹۹۱ء

۲۵۔ محمد اظہار الحق، تلخ نوائی (کالم) "پہاڑ سر بن کا" المیزان پبلشرز، الکریم مارکیٹ، اردو بازار لاہور، ۲۰۱۶ء، ص ۱۳۴

۲۶۔June-UNWTO-"Tourism Highlights-17 June 2012.

۲۷۔NWTO-World Tourism Barometer -" World's top destinations by international tourism receipts, 16 June 2012.

۲۸۔ محمد اظہار الحق، تلخ نوائی (کالم) "جب پتھر بولیں گے، جب پانی بھڑکے گا "المیزان پبلشرز، الکریم مارکیٹ، اردو بازار لاہور، ۲۰۱۶ء، ص ۱۱۶

۲۹۔ محمد اظہار الحق، تلخ نوائی (کالم) "پہاڑ سر بن کا "المیزان پبلشرز، الکریم مارکیٹ، اردو بازار لاہور، ۲۰۱۶ء، ص ۱۳۴۔۱۳۳

۳۰۔The Science Of Political Economy by Henry George.

۳۱۔The Theory and Practice Of Banking 1883.

۳۲۔ خلیج ٹائمز، روزنامہ، (کامن گراؤنڈ نیوز) ۷ دسمبر، ۲۰۰۷ء

۳۳۔ محمد اظہار الحق، تلخ نوائی (کالم) "جن "المیزان پبلشرز، الکریم مارکیٹ، اردو بازار لاہور، ۲۰۱۶ء، ص ۲۱۔۱۹

۳۴۔ محمد اظہار الحق، تلخ نوائی (کالم) "چراغ "المیزان پبلشرز، الکریم مارکیٹ، اردو بازار لاہور، ۲۰۱۶ء، ص ۳۲۔۲۹

۳۵۔ عبد الحئی، اردو صحافت اور سر سیّد احمد خان، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی (۶)، ۲۰۰۸ء، ص ۱۹

۳۶۔ محمد اظہار الحق، تلخ نوائی (کالم) "ایک عجیب غم "المیزان پبلشرز، الکریم مارکیٹ، اردو بازار لاہور، ۲۰۱۶ء، ص ۲۵۱

۳۷۔ محمد اظہار الحق، تلخ نوائی (کالم) "ایک تصویر دیکھ کر "المیزان پبلشرز، الکریم مارکیٹ، اردو بازار لاہور، ۲۰۱۶ء، ص ۲۶۵

۳۸۔ پروفیسر محمد شاہد حسین، ابلاغیات، ایضاً، ص ۴۵

۳۹۔ محمد اظہار الحق، تلخ نوائی (کالم) "اس عید پر "المیزان پبلشرز، الکریم مارکیٹ، اردو بازار لاہور، ۲۰۱۶ء، ص ۵۱۔۵۰

۴۰۔ محمد اظہار الحق، تلخ نوائی (کالم) "رخصتی "المیزان پبلشرز، الکریم مارکیٹ، اردو بازار لاہور، ۲۰۱۶ء، ص ۲۶۸۔۲۶۷

۴۱۔ مسلم بن حجاج، اسلامی ریاست بحوالہ مسلم شریف، کتاب الایمان باب نمبر ۲۰، ص ۴۱۶

۴۲۔ کنز الاعمال، جلد ۶، ح ۲۹۷

۴۳۔ محمد اظہار الحق، تلخ نوائی (کالم) "کافر بھارت" المیزان پبلشرز، الکریم مارکیٹ، اردو بازار لاہور، ۲۰۱۶ء، ص ۱۵۶۔۱۵۴

۴۴۔ محمد اظہار الحق، تلخ نوائی (کالم) "نہیں! ڈاکٹر قدیر خان صاحب! نہیں" المیزان پبلشرز، الکریم مارکیٹ، اردو بازار لاہور، ۲۰۱۶ء، ص ۱۵۱۔۱۵۰

باب چہارم

مجموعی جائزہ

معروف اردو کالم نگار محمد اظہار الحق "تلخ نوائی" کے نام سے اپنا اردو کالم مختلف اردو اخبارات میں لکھتے ہیں۔ آج کل باقاعدگی کے ساتھ روزنامہ "۹۲ نیوز" میں وہ اپنا کالم لکھ رہے ہیں۔ اُن کے کالموں کا مجموعہ "تلخ نوائی" کے نام سے چھپ چکا ہے۔ محمد اظہار الحق پاکستان کی نامور ادبی شخصیت ہیں۔ اُن کا شمار دورِ حاضر کے نمایاں کالم نگاروں میں ہوتا ہے۔ جمعرات ۲۹ نومبر ۲۰۱۸ء کا دن میری تحقیق میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ میں نے محمد اظہار الحق صاحب سے تحقیق کے سلسلے میں کچھ سوالات کیے تو انھوں نے کمال مہربانی کرتے ہوئے مجھے مذکورہ دن، ۱۱ بجے، اسلام آباد میں، ڈیفنس ہاؤسنگ سوسائٹی میں واقع اپنے نو تعمیر شدہ گھر میں ملاقات کے لیے وقت دے دیا۔ میں مقررہ وقت پر اُن کے سامنے موجود تھا۔ چار گھنٹوں سے زیادہ جاری رہنے والی اِس یادگار ملاقات میں محمد اظہار الحق صاحب اور ان کی بیگم نے اپنی ازدواجی زندگی، اپنے خاندان اور اظہار صاحب کی کالم نگاری کے بارے میں بہت تفصیلی معلومات فراہم کیں۔ بیگم اظہار الحق کا کہنا تھا کہ پہلے ملازمت اور اب صحافتی ذمہ داریوں کے باوجود اُن کے میاں محمد اظہار الحق ہمیشہ گھر کے تمام معاملات میں اُن کی بھرپور معاونت کرتے ہیں۔ بچوں سے بہت پیار کرتے ہیں اور اُن کو بھرپور وقت دیتے ہیں اور جو وقت بچوں اور فیملی کے لیے ایک بار مختص کر دیں، پھر اُس میں کسی اور مصروفیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اُن کی پہلی اور آخری ترجیح اُن کے بچے اور اُن کا گھر ہے۔ بچوں میں انھیں اپنی نواسی "زینب" سے خصوصی لگاؤ ہے جو اُن کی فیملی کی سب سے پہلی اور سب سے لاڈلی بچی ہے۔

محمد اظہار الحق پاکستان کے چوٹی کے اخبارات مثلاً روزنامہ جنگ، روزنامہ نوائے وقت، روزنامہ دنیا، روزنامہ جناح اور موجودہ وقت میں روزنامہ ۹۲ نیوز میں باقاعدگی سے "تلخ نوائی" کے عنوان سے ہفتے میں چار کالم لکھتے ہیں۔ اُن کے کالم سیاست، معاشرت، ترقی پسندی، اخلاقیات اور مذہب کے گرد گھومتے ہیں۔ محمد اظہار الحق کے کالموں میں جہاں دلکش انفرادیت ہے وہیں اردو، عربی اور فارسی میں خاص مہارت کی وجہ سے آپ کے کالموں میں ان تمام زبانوں کی ادبی چاشنی بھی جھلکتی ہے۔ آپ کے کالم عام فہم ہونے کی بنا پر عوامی سطح پر پسندیدگی اور دلچسپی سے پڑھے جاتے ہیں۔ محمد اظہار الحق کی کالم نگاری کی نمایاں خوبیاں اپنی بات کو کہانی کے انداز میں دلچسپ پیرائے اور مؤثر طریقے سے کہنا، عام آدمی کے دکھ سکھ کو موضوع بنانا اور زندگی اور

معاشرے کی تلخ حقیقتوں کو کھل کر بیان کرنا ہیں۔ محمد اظہار الحق کی کالم نگاری کا نمایاں وصف اُن کے عام فہم الفاظ اور امتِ مسلمہ کی عظمتِ رفتہ کے آئینے میں موجودہ عہد کے معاملات کو جاننے اور پرکھنے کی کوشش ہے، مسلمانوں کے شاندار ماضی کا تذکرہ کرتے ہوئے بظاہر وہ ماضی پرستی یا نسٹیلجیا کا شکار نظر آتے ہیں مگر ایسا ہر گز نہیں ہے، وہ نہ تو حال سے کٹے ہوئے ہیں اور نہ ہی اُن کا رویہ پدرم سلطان بود کا ہے۔ اِس میں ذرا بھی شک نہیں ہے کہ اسلامی عظمت پر اور اُس کے احیاء کی خواہش اُن کی کالم نگاری میں بدرجۂ اُتم نظر اتی ہے۔ محمد اظہار الحق کی کالم نگاری کا وصف یہ بھی ہے کہ اُن کی کالم نگاری میں امتِ مسلمہ کے زوال کے حوالے ضرور ملتے ہیں مگر اُن میں مایوسی ہر گز نہیں ہوتی ہے، وہ ہمیشہ امید کا پیغام دیتے ہیں اور ہر قسم کی ناامیدی کی نفی کرتے ہیں، اُن کی کالم نگاری ہمیشہ قرآن کے اِس حکم کے تابع نظر آتی ہے۔ لا تقنطو من رحمۃ اللہ ۔ اور اللہ کی رحمت سے کبھی ناامید مت ہونا۔

محمد اظہار الحق کو یہ ملال ضرور ہے کہ ملتِ اسلامیہ نے درویشی اور فقر کو چھوڑ کر جب سے بادشاہی اور زر پوشی اختیار کی ہے، تب سے زوال پذیر ہے اور ہر جگہ سے ہزیمت کے تمغے سینوں پہ سجا رہی ہے۔ خدا کی پسندیدہ ترین امت دنیا بھر میں ذلیل وخوار ہو رہی ہے اور ہر جگہ اس کا تمسخر اڑایا جاتا ہے۔ محمد اظہار الحق کی نظموں کی طرح اُن کے کالموں میں بھی بعض اوقات اُن کا لہجہ تلخ ہو جاتا ہے، لیکن جب ہم آج کے دور میں امتِ مسلمہ کی حیثیت، کردار اور اُس کی حالتِ زار کو دیکھتے ہیں اور اسلامی مراکز کی کارکردگی کو ذہن میں لاتے ہیں تو پھر ہمیں محمد اظہار الحق کی "تلخ نوائی" کا بھرپور جواز مل جاتا ہے اور اُن کے کالموں کے نام کی معنویت ہم پر پوری طرح واضح ہو جاتی ہے۔ واقعی اُن کے کالم "تلخ نوائی" اسمِ بامسمیٰ ہیں۔

محمد اظہار الحق امتِ مسلمہ کو لگے ہر روگ سے اچھی طرح باخبر ہیں۔ وہ عہدِ رواں میں مسلمانوں کے زوال اور پسماندگی کے جملہ اسباب سے بخوبی واقف ہیں۔ مگر اِن سب باتوں کے باوجود ہر اچھے اور بڑے کالم نگار کی طرح محمد اظہار الحق بھی کبھی مایوس دکھائی نہیں دیتے ہیں، انھیں یقینِ کامل ہے کہ امتِ مسلمہ ایک دن اپنا کھویا ہوا وقار ضرور حاصل کر لے گی۔ محمد اظہار الحق کی کالم نگاری تاریخی سچائیوں پر مشتمل ہے جو ایک عالم گیر پیغام دیتی ہے اور یہ کالم نگاری ایک بڑے تناظر میں دیکھے جانے کا تقاضا کرتی ہے۔ اگرچہ محمد اظہار الحق کی کالم نگاری کے کئی موضوعات ہیں مگر مسلم تہذیب کی عظمتِ رفتہ اُن کا پسندیدہ موضوع ہے۔ وہ مسلم تہذیب کو انسانیت کے لیے ایک مثالی تہذیب سمجھتے ہیں اور اکثر اِس سے انسپائریشن بھی لیتے رہتے ہیں اور اِس تہذیب

کے زوال پر وہ اداس اور دلگرفتہ بھی نظر آتے ہیں۔ محمد اظہار الحق کی کالم نگاری کی اہم خوبی کردار سازی بھی ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ معاشرتی اور اجتماعی تعمیرِ نو میں افراد کی اخلاقی بالیدگی اور بلند کرداری کو بڑی اہمیت حاصل ہے چنانچہ اسلام کی اعلیٰ اخلاقی اور روحانی اقدار کے انسانی سیرت و کردار میں ڈھلنے کی آرزو اُن کی کالم نگاری میں بار بار سامنے آتی رہتی ہے۔ محمد اظہار الحق کی کالم نگاری کی انفرادیت یہ بھی ہے کہ انھوں نے کالم نگاری کے میدان میں اپنی الگ پہچان بنائی ہے اور الگ دنیا بسائی ہے ، یہ دنیا اپنی سادگی، اپنی تازگی، اپنے مناظر، اپنے رنگوں، اپنی فضاؤں، اپنی ہواؤں، اپنے وقوعوں اور اپنی خوشبوؤں ہر لحاظ سے دوسروں سے الگ اور منفرد ہے، انھوں نے اپنے من کی دنیا میں ڈوب کر کالم نگاری کی ہے، اِس لیے اُن کے ہر لفظ اور ہر سطر میں تاثیر ہے۔ محمد اظہار الحق کی اردو کالم نگاری میں کوئی فقرہ بھی ایسا نہیں ہوتا ہے جسے غیر ضروری یا فالتو کہہ کر نکالا جاسکے، آسان اور عام فہم زبان میں، عوامی دلچسپی اور روز مرّہ زندگی سے متعلقہ موضوعات پر، دل نشیں انداز میں، مختصر مگر جامع انداز میں لکھے جانے والے ان کے کالم عوامی سطح پر پسند کیے جاتے ہیں۔ محمد اظہار الحق کی اردو کالم نگاری کی نمایاں خصوصیات میں سلاست، اختصار اور جامعیت ہیں اور انھی خصوصیات کی وجہ سے اُن کے کالم عوامی سطح پر مقبول ہیں۔

محمد اظہار الحق کھری اور سچی بات کہنے والا صحافی ہے۔ مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی شک نہیں ہے کہ اب تک جتنے سرکاری افسران بھی ریٹائرمنٹ کے بعد صحافت کے شعبے میں لکھتے رہے ہیں یا لکھ رہے ہیں ،اُن میں سے جنھوں نے اپنے قلم اور اپنے ضمیر کے ساتھ انصاف کیا ہے اُن میں محمد اظہار الحق سرِّ فہرست ہیں۔ اپنے قلم سے تلوار کی طرح صرف وہی ریٹائرڈ سرکاری افسر لکھ سکتا ہے جِس نے ساری عمر ایک صاف ستھری ملازمت کی ہو، جِس کے ضمیر پر کوئی بوجھ نہ ہو اور جسکے دامن پر داغ نہ ہو۔

محمد اظہار الحق کا اپنی جڑوں سے مضبوط رشتہ ہے، تبھی انھوں نے اپنی تحریروں اور کالموں میں خود کو امر کر لیا ہے۔ جتنے خوبصورت کالم محمد اظہار الحق نے گاؤں کی زندگی، روایات اور گاؤں کے بزرگوں پر لکھے ہیں، وُہ اپنی جگہ الگ جہان اور نئی دنیا ہے۔ اُن کے وُہ کالم پڑھ کر یوں لگتا ہے جیسے انھوں نے ہمارا ماضی ہمارے سامنے لا کھڑا کیا ہو۔ محمد اظہار الحق کی تحریر کی یہ خوبی ہے کہ قاری خود کو اُس کے سحر سے نہیں بچا سکتا ہے۔ قاری کو لگتا

ہے کہ یہ محمد اظہار الحق کا گاؤں نہیں ہے، اُن کا بچپن نہیں ہے بلکہ یہ تو قاری کا اپنا گاؤں اور اپنا بچپن ہے۔ محمد اظہار الحق کے وہ کالم جن میں انھوں نے گاؤں سے وابستہ یادوں کو اپنے قارئین کے ساتھ بانٹا ہے، بلاشبہ اُن کے بہترین کالموں میں شمار کیے جاسکتے ہیں اور اُن کا ہر قاری ایسے کالموں کو اپنے اوپر بیتتے ہوئے محسوس کر سکتا ہے۔ محمد اظہار الحق نے اپنے کالموں میں گاؤں کے حوالے سے جو لینڈ اسکیپ تشکیل دیا ہے، اُس کا حسن لاثانی اور رحنائی بے مثال ہے۔ یہ لینڈ اسکیپ گھنے پیڑوں، ہری جھاڑیوں اور سبزے کی موٹی تہوں پر مشتمل ہے، ہم جولیوں کی ٹولی ہے جو پہاڑوں سے اترتی ہے اور نشیبی چٹانوں میں بہتے ہوئے میٹھے جھرنوں کی جانب جاتی ہے ، گیت گاتے چرواہے ہیں جو اپنے اپنے ریوڑ ہانکتے گاؤں کو واپس آرہے ہیں۔ موجودہ عہد میں کچھ لوگ ادب پر جمود طاری ہونے کا الزام دھرتے ہیں مگر میں سمجھتا ہوں کہ ادب پر جمود قطعاً طاری نہیں ہوا ہے البتہ ہمارا ادب نام و نمود کا شکار ضرور ہو گیا ہے مگر شہرت کی اِس بھگدڑ میں آج بھی کچھ اہلِ قلم ایسے جو استقامت کے ساتھ اپنا کام کیے جارہے ہیں اور اِن میں ایک نمایاں نام محمد اظہار الحق کا بھی ہے جو اپنے کالموں کے ذریعے بہترین صحافتی اور ادبی خدمات سر انجام دے رہے ہیں۔ محمد اظہار الحق نے ادب پڑھ رکھا ہے، چاہے وہ اردو کلاسک ہو، انگلش ہو یا پھر فارسی اور اِس سب کا استعمال وہ جانتے ہیں اور اِسی چیز نے اُن کے کالموں کا حسن اور اثر پذیری بڑھادی ہے۔ ادب سے محبت نے انھیں اِس قابل کر دیا ہے کہ وُہ نئے نئے موضوعات پر لکھ سکیں تا کہ قاری کبھی یکسانیت اور بوریت کا شکار نہ ہو۔ اسلام اور اسلامی دنیا کے عروج و زوال پر اُن کی بعض تحریریں ایسی بے مثال ہیں کہ جنھیں ہمارے نصاب کا حصہ ہونا چاہیے۔ محمد اظہار الحق اپنی دھرتی ماں، اپنی مٹی، ماں بولی، بھولی بسری روایتوں اور فوک کہانیوں سے جتنا پیار کرتے ہیں، وہ آپ کو ایک اور دنیا میں لے جاتا ہے اور آپ پھر اُسی دنیا میں خود کو گم کرنے کے خواہش مند ہو جاتے ہیں۔ الغرض محمد اظہار الحق کی تحریروں میں ہمیں نئے خیالات ملتے ہیں، سوچ اور فکر کی ایک نئی دنیا ملتی ہے، جہاں ماضی، حال اور مستقبل باہم گلے ملتے محسوس ہوتے ہیں۔ اُن کے قلم میں تیز کاٹ ہے، درد ہے، انسان دوستی ہے، گاؤں کی برستی بارش میں کچی مٹی کی بھینی بھینی خوشبو ہے، صدیوں پرانی روایات کا اِحیاء ہے اور سب سے بڑھ کر اپنے سے طاقتور کے خلاف، ظالم حکمران کے سامنے بولنے کی جرات ہے۔ جو چیز محمد اظہار الحق کو اردو کالم نگاروں میں ممتاز کرتی ہے، وُہ یہ

ہے کہ اُن کے اندر یورپی ملکوں کے خلاف وُہ روایتی تعصّبات نہیں ہیں جو ہمارے اکثر کالم نگاروں اور لکھاریوں میں نظر آتے ہیں، وُہ اگر بیرونِ ملک گئے تو اُن ملکوں کی اچھی چیزوں اور اچھی روایات کا پرچار کیا اور اُنھوں نے مغربی معاشروں کو نصیحتیں کرنے یا مشرقی روایات کی عظمت کے گیت گانے کے بجائے الٹا ہمیں یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ ہم اُن غیر مسلموں سے کون کون سی اچھی باتیں سیکھ کے اپنا سکتے ہیں۔ محمد اظہار الحق کی کالم نگاری ہمیشہ امن، محبت اور رواداری کا پیغام دیتی ہے۔ وہ معاشرے کو ہر طرح کے استحصال سے پاک اور ہر سطح پر انصاف کی حکمرانی دیکھنا چاہتے ہیں۔

محمد اظہار الحق بہت شدت سے ایک ایسے مثالی معاشرے کے خواہاں ہیں جہاں کھلی بانہوں اور کھلے دروازوں کے ساتھ آنے والوں کو گھروں میں جگہ دی جائے، دل بھی تو گھر ہوتے ہیں اور اِن گھروں میں محبتوں سے کشاد گیاں اور نفرتوں سے کشید گیاں پیدا ہوتی ہیں، ایک ایسی جلیل و جمیل تہذیب جس کے آنگن میں چاندنی چھٹکی ہوئی ہے، جہاں پیڑ سایہ دار اور پودے ثمر بار ہیں، جہاں شفاف نہروں کی ترل رل، ترل رل، گاتی گنگناتی ہواؤں کی کی ہم نوا ہوتی ہے، جہاں فلک بوس پہاڑوں کی چٹانوں میں عقاب بسیرا لیتے ہیں، جہاں پرندے چہچہاتے ہیں تو فضائیں جھوم اٹھتی ہیں، جہاں سحر دم سبز اوڑھنی میں لپٹی کونپلوں کا منہ شبنم دھلانے اترتی ہے تو بلبل مست ترنم ہو جایا کرتی ہے، جہاں راتیں صبحوں کی امیدیں ہمراہ لے کر اترتی ہیں اور جہاں صبحیں جواں امنگوں کی ترنگوں کے ترانے سناتی ہیں، جہاں جذبے راج کرتے ہیں اور ارادے ولولے بنتے ہیں۔ ایسے فعال اور خوش حال تمدن والی بستیاں محمد اظہار الحق کے تخلیقی خواب کو آب و تاب بخشنے کا سبب بنتی ہیں اور جب اِس حسین خواب کا بیان محمد اظہار الحق کے کالموں کے لفظوں میں ظہور کرتا ہے تو ایک بارعب اور جلال بھرے فنی کمال کا پیش خیمہ بن جاتا ہے، اِس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ عصری آگہی محمد اظہار الحق کی کالم نگاری میں بہر صورت پل پل اور سطر سطر موجود رہتی ہے اور ہمیں اپنے ہم عصر مسائل کی آنچ اظہار کے فن میں سلگتی ملتی ہے۔ محمد اظہار الحق ایسے عہد ساز کالم نگار ہیں کہ اُن کے فنِ کالم نگاری میں موجود یہی چنگاری شبِ تاریک کا دامن چیر کر روشنی کا سراغ دینے والے چراغ کی اولین لو جلانے کا جواز بن جایا کرتی ہے، موجودہ زمانے میں اردو کی یہ بہت بڑی خوش نصیبی اور خوش قسمتی ہے کہ ہمارے عہد کی جبیں پر لکھی ہوئی ہر تمنا کو محمد اظہار الحق

نے خوب صورت اور آسان زبان دی ہے، اِس لیے یہ کہنا کسی طور بھی غلط نہیں ہو گا کہ اظہار آرٹ عصرِ حاضر کی کالم نگاری میں ایک بڑا موثر اور معتبر تخلیقی قوت کا درجہ حاصل کر چکا ہے۔ محمد اظہار الحق نے اگرچہ کم لکھا ہے، مگر جو بھی لکھا ہے، باکمال اور لاجواب لکھا ہے۔ اُنھوں نے سچ کے سوا کچھ نہیں لکھا۔ محمد اظہار الحق خواص میں رہنے کے باوجود عوام میں سے ہیں، اپنی دھرتی اور عوام سے اُن کا رابطہ کبھی بھی کم نہ ہوا ہے اور انھوں نے جو کچھ بھی لکھا ہے، وُہ عوام کے لئے لکھا ہے اور عوام نے بھی اُن کے کام کی بھرپور پذیرائی کی ہے۔ محمد اظہار الحق اپنے خیالات، کام، فکر، سوچ اور تحریروں کی وجہ سے اپنے قارئین کو تادیر یاد رہیں گے۔ کالم نگاری میں اظہار الحق کا اظہارِ بیان سادہ اور عام فہم ہے۔ اگرچہ اظہار کے اِس اظہار کا ہنر جبلی طور پر ودیعت شدہ ہے مگر اِس جوہر کو صیقل کرنے میں اُن کی خاندانی روایت کا بڑا ہاتھ ہے، اظہار الحق کے والدِ گرامی حافظ محمد ظہور الحق ظہور کی "کلیاتِ ظہور" کا مطالعہ اِس بیان کی مزید تائید کرتا ہے۔ اظہار الحق کے کالموں کا مستقل قاری ہونے کے ناطے میرا یہ ناقص خیال ہے کہ کالم نگاری کے میدان میں اُن کا انداز بہت منفرد، اچھوتا اور تازہ ترین ہے۔

محمد اظہار الحق کی کالم نگاری کے موضوعات اتنے دلچسپ اور انواع و اقسام کے ہوتے ہیں کہ اُن کے قارئین کو ایسا لگتا ہے کہ زندگی کی جتنی بھی رنگا رنگی ہے، جتنے بھی زندگی کے شعبے ہیں اور بہت اعلیٰ قوتِ مشاہدہ کے حامل کسی کالم نگار کی تیز نظروں کی زد میں جو کچھ بھی آسکتا ہے، وُہ سب کچھ محمد اظہار الحق نے اپنے کالموں میں سمو دیا ہے۔ محمد اظہار الحق نے اپنی کالم نگاری میں معاشی اور سماجی تضادات کی ایک بہت توانا لہر اپنے قارئین کے سامنے پیش کی ہے۔ کہیں براہِ راست اور کہیں بالواسطہ انھوں نے جبر کے اِس نظام کے خلاف اپنی آواز بڑی نمایاں طور پر بلند کی ہے، اِس لیے محمد اظہار الحق کی کالم نگاری کو جہاد بالقلم کی کالم نگاری بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔

اظہار الحق کو علمِ اقتصادیات پر دسترس رکھنے کی وجہ سے بخوبی پتہ ہے کہ معاشرے میں افراطِ زر کی کیا صورتِ حال ہے اور تفریطِ زر کیوں ہوتا ہے۔ وہ جاگیر دارانہ سماج کی حقیقت سے آگاہ ہے اور ادراک رکھتا ہے کہ اِن جاگیر داروں نے غیرت اور ملکی حمیت کو بیچ کر، کیسے گھوڑے بھگائے اور جہاں جہاں اُن کے گھوڑوں کے نقشِ

قدم پہنچے، وہاں تک اُن کی ملکیت ٹھہری، اظہار الحق بلاشبہ سوچنے والا ذہن لے کر پیدا ہوا ہے اور اُسے علم ہے کہ کیسے نااہل تاج و تخت کا وارث ٹھہرے اور حق داروں کو خاک نشین کر دیا گیا۔

محمد اظہار الحق نے ایک سینئر بیوروکریٹ ہوتے ہوئے بھی بیوروکریسی کے خلاف اپنے کالموں میں خوب کھل کے لکھا ہے، اور بیوروکریسی کا حقیقی پوسٹ ماٹم کیا ہے۔ محمد اظہار الحق کی ایسی بے باکی اور باہمت سچائی کی بے ساختہ داد دینی پڑتی ہے کون نہیں جانتا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کا کالا قانون آج بھی پوری تابانی کے ساتھ چمک رہا ہے اور سیاست دان اور بیوروکریٹ مل کر وطنِ عزیز میں بسنے والی سادہ لوح عوام کا کچھ اِس طرح سے استحصال کر رہے ہیں جیسے یہ اُن کے اپنے لوگ نہ ہوں، برٹش انڈیا کے محکوم و مظلوم عوام ہوں۔ محمد اظہار الحق وطنِ عزیز کے موجودہ حکمرانوں سے مایوس ہو چکے ہیں، وُہ اپنے کالموں میں بارہا اپنا یہی دُکھ بیان کرتے نظر آتے ہیں کہ ہمارے اربابِ اختیار نے کبھی بھی اپنی عوام کے لیے کچھ نہ سوچا اور عملی طور پر غریب عوام کے لیے بس جھوٹے وعدے اور مکر و فریب ہی سے کام لیا۔ محمد اظہار الحق نے اپنی کالم نگاری میں غریبوں سے بے پناہ محبت کا ثبوت اکثر دیا ہے مگر ساتھ ساتھ لٹیروں اور غاصبوں پر اپنے لفظوں سے سنگ باری کرتے نظر آتے ہیں، اپنے کالموں کی شگفتہ تحریروں میں وُہ بڑے کاٹ دار جملے لکھتے ہیں اور اپنے ٹارگٹ کو کچھ اِس انداز سے رگیدتے ہیں کہ اُن کا شکار کسی طرح سنبھل ہی نہیں پاتا اور قاری کے لیے فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ وُہ شکار سے ہمدردی کرے یا محمد اظہار الحق کو اُن کی ادبی مہارت پر داد دے، بلاشبہ محمد اظہار الحق نے اپنی بے مثال تحریروں اور اپنے باکمال کالموں سے اپنی کالم نگاری کو منوالیا ہے۔

محمد اظہار الحق نے اپنی کالم نگاری میں ملک کے ہر طبقے اور حکومت کے ہر ادارے کے بارے میں لکھا ہے، انھوں نے منفی کاموں پر تنقید کے ساتھ ساتھ تعمیری اور مثبت کاموں پر خوب کھل کر تعریف بھی کی ہے، مگر بد قسمتی سے انھیں وطنِ عزیز میں تعمیر سے زیادہ تخریب ہی نظر آئی۔ انھوں نے وطنِ عزیز کے سیاست دانوں اور جاگیر داروں کی انسانیت سوز پالیسیوں اور اور اُن کی استحصالی سوچ کی ہمیشہ مخالفت کی ہے انھوں نے حکمرانوں کی بے حسی اور سنگ دلی کو اپنی تنقید کا نشانہ بنایا ہے اور اپنے کالموں میں بہت کھل کر ایسی ظالمانہ فکر کے خلاف لکھا ہے جس میں غریب کے لیے زندگی روز بروز مشکل سے مشکل تر ہوتی جا رہی ہے اور اُسے اپنی سانسوں کا ناطہ قائم رکھنے کے لیے بھی ہمیشہ جان کے لالے پڑے رہتے ہیں۔ محمد اظہار الحق نے موجودہ ملکی سیاست پر کھل کر لکھا ہے، بد قسمتی سے ہمارے وطن میں حد سے زیادہ کرپشن ہے، نااہلی اور نالائقی انتہا درجے

کی ہے، ایسی بے حسی ہے کہ وطنِ عزیز کی کسی کو فکر ہی نہیں ہے اور ہمارے موجودہ سیاست دانوں کو تو عوام کی فلاح و بہبود کا احساس ہی نہیں ہے۔

محمد اظہار الحق نے اپنی کالم نگاری میں حکمران طبقے کی طرف سے غریب عوام کے ساتھ کی جانے والی زیادتیوں اور حق تلفیوں کے بارے میں بھی بہت کھل کر لکھا ہے، انھوں نے معاشرے میں رونما ہونے والے ایسے دل خراش واقعات کو عام قاری کے سامنے لا کر یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ ہمارے سیاست دان غریب عوام کا کس طرح سے استحصال کر رہے ہیں۔ محمد اظہار الحق اپنے کالموں میں جب پاکستان کے حکمرانوں کا موازنہ غیر ملکی حکمرانوں سے کرتے ہیں تو انھیں شدید مایوسی اور دکھ ہوتا ہے کہ ہمارے حکمران کس قدر غیر فعال اور سطحی ہیں، غیر مسلم حکمران اپنے ملک اور اپنی قوم سے کس قدر مخلص ہیں جب کہ ہمارے حکمرانوں کو اپنے ملک اور عوام سے کبھی بھی وُہ لگاؤ نہیں ہو سکا جو اصل میں ہونا چاہیے تھا، اِنھیں بس اپنی تجوریاں بھرنے اور ملکی دولت لوٹ کر غیر ملکی بنکوں کے اکاؤنٹس بھرنے سے دلچسپی ہے۔

محمد اظہار الحق ملکی حالات کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی حالاتِ حاضرہ اور خطے کی صورتِ حال پر بھی بہت گہری نظر رکھتے ہیں اور اُن کی معاملہ فہمی بہت غضب کی ہے، آج سے کافی عرصہ پہلے اُنھوں نے اپنے ایک کالم " کاش! درمیان میں دیوار ہوتی" میں پاکستان میں امنِ عامہ کی صورتِ حال اور اُس کے اسباب کے بارے میں جو اپنی رائے پیش کی تھی وہ ہمارے وطنِ عزیز کے آج کل کے حالات کے عین مطابق ہے، اِس سے محمد اظہار الحق کی سیاسی معاملہ فہمی اور اور حسنِ ادراک کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ محمد اظہار الحق کالم نگاری کے میدان میں ایک عہد ساز اور اسلوب ساز صحافتی شخصیت ہیں، محمد اظہار الحق کی کالم نگاری میں عصرِ حاضر کے معروف کالم نگاروں جیسی تمام خصوصیات بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ جب ہمارے تمدن کے روشن راستے گرد سے اٹ کر اور گمراہ قافلوں کی دھول میں کسی بھول کی طرح گم ہو کر اوجھل ہونے لگے تھے تو محمد اظہار الحق نے اپنے کالموں میں، اپنی تحریر کے ذریعے اسلامی تہذیب کی منور رہگذاروں پہ اپنے سادہ مگر پُر وقار لفظوں سے تمدن کے چراغ جلائے، منزلوں کی طرف جانے والی راہوں پر یہ روشنی ایک آرزو بھرے خواب کی تعبیر لگتی ہے۔ جب خواہشیں اور خواب سچے جذبوں کے ہم رکاب ہوں تو مرادوں کے گلاب کھلتے دیر نہیں لگتی۔ اچھا ادب بلاشبہ تسخیرِ قلب کا سبب ہوتا ہے، کسی بھی صنفِ ادب کا، ایک اچھے ادبی فن پارے کا سحر دلوں کو اپنی جاگیر بناتا چلا جاتا ہے اور اُس کی تاثیر صبح کی پہلی کرن کی تنویر کی طرح من کی منڈیروں پر سحر کی نوید رقم کرتی چلی جاتی ہے۔ محنتیں اور محبتیں کبھی رائیگاں نہیں جاتیں۔ محمد اظہار الحق کی تخلیقی محنتیں اور سچی قدروں سے

وابستہ محبتیں ایک ایسے منفرد نثری اسلوب کی تخلیق کا جواز بن گئیں جس نے بہت سے ہم عصر صحافیوں اور ادیبوں کو اپنے حلقۂ اثر میں لے لیا۔ محمد اظہار الحق کی انفرادیت یہ ہے کہ وہ اردو کالم نگاری کی عام، مروّج شارعِ عام پر نہیں چلا اور اب تو اپنے اختیار کردہ اِس نئے راستے پر وہ اِس قدر آگے نکل چکا ہے اور اُس کے راستے پر دوڑنے والے گھوڑوں کی ٹاپوں میں منزلوں تک رسائی کا اعتماد بہت واضح طور پر گونجنے لگا ہے اور یہ راستہ شارعِ عام ہونے کے احساسِ تفاخر سے اُن کا فن مزید چمک اٹھا ہے۔ محمد اظہار الحق نے اپنی کالم نگاری میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ شاعری کی طرح نثر بھی اظہار کا فن ہے اور صحافتی اظہار میں صداقت ہی کامرانی کی بشارت عطا کرتی ہے۔ کام کوئی بھی ہو، مشن جیسا بھی کٹھن ہو، کارنامہ اُس وقت بنتا ہے جب اُس میں محنتی پسینے کی خوشبو اور سچے خوابوں سی آرزو گھل مل جائے۔ کسی بھی معیاری ادب کی تخلیق میں درحقیقت فنی ریاضت، تخلیقی خلوص اور سچائی کی توانائی ہی اصل قوت ہیں اور محمد اظہار الحق نے حق کے اظہار میں اپنی تخلیقی قوتوں کو ولولوں کا ہم معنی بنانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی اور یہی وجہ ہے کہ اب اسلام کے عالم گیر اقداری اور تمدنی نظام کی بات آئے تو فنونِ حاضرہ میں تین حوالے بہت اہم ہو کر سامنے آتے ہیں۔

فنِ تعمیر میں مغل آرٹ

فنِ تصویر میں چغتائی آرٹ

اور فنِ تحریر میں اظہار آرٹ

محمد اظہار الحق کی کالم نگاری میں تاریخی اور تمدنی موضوعات اور شعور جگہ جگہ ملتا ہے۔ محمد اظہار الحق نے پاکستان کے علاوہ امتِ مسلمہ اور خطے کے دیگر مسائل کے بارے میں بھی کھل کر لکھا ہے اور اُن کے قلم نے ہر کسی کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا ہے۔ محمد اظہار الحق نے ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کے تناظر میں بھی بہت کچھ لکھا ہے، جہاں اُن کے کالموں میں تاریخ سے گہری رغبت کا پتہ چلتا ہے، وہاں اُن کے کالم حب الوطنی کا بھی گہرا درس دیتے نظر آتے ہیں۔ محمد اظہار الحق نے چونکہ ڈھاکہ یونیورسٹی سے پڑھا تھا اِس لیے سقوطِ ڈھاکہ کی وجوہات سے وہ بہتر طور پر آگاہ تھے، اور اُن کو اسی لیے ملک ٹوٹنے کا رنج بھی اوروں کی نسبت زیادہ تھا، اپنے اِس درد کو انھوں نے اپنی کالم نگاری میں خونِ جگر کے ساتھ لکھا ہے۔ محمد اظہار الحق ایک سچے، کھرے اور بے باک صحافی ہیں اور انھوں نے ہمیشہ صحافت کے تقدس کا خیال رکھا ہے۔ ان کی کالم نگاری کی خوبیوں میں ایک خوبی اُن کی حقیقت پسندی اور بے لاگ رائے ہے۔ اگر کسی غیر مسلم میں بھی محمد اظہار الحق

کو کوئی وصف نظر آتا ہے، تو وُہ اُس کی دل کھول کر تعریف کرتے ہیں اور اگر کسی مسلمان میں بھی اُنھیں کوئی خامی نظر آتی ہے تو برملا اُس کا اظہار بھی کر دیتے ہیں۔ محمد اظہار الحق نے نہ صرف ملکِ پاکستان کے مشاہیر کے بارے میں لکھا ہے بلکہ اگر انھیں باہر کے کسی ملک کی، کسی قابل ہستی میں اگر کوئی سبق نظر آیا ہو تو انھوں نے کسی تعصب کے بغیر کھل کر اُس کی بھی تعریف کی ہے۔ اسی طرح محمد اظہار الحق جب تاریخ کا ذکر کرتے ہیں تو تفصیل سے اور دلچسپ پیرائے میں کرتے ہیں، قاری خود کو اُسی دور میں محسوس کرتا ہے۔ محمد اظہار الحق نے اپنی کالم نگاری میں مسلم تہذیب کی سطوتیں اور ثروتیں اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر کی ہیں جس سے ان کی کالم نگاری کا حسن دو آتشہ ہو گیا ہے۔ محمد اظہار الحق نے چونکہ باقاعدہ طور پر ازبک زبان سیکھ رکھی ہے، اِس لیے وہ وسط ایشیا اور خصوصاً ازبکستان کے ادب، تاریخ اور ثقافت کے بارے میں بہتر جانتے ہیں، اُن کو اِسی وجہ سے ازبکستان اور دیگر وسط ایشیائی ریاستوں کی طرف سے اکثر کانفرنسوں میں شرکت کی دعوت اور مواقع ملتے رہتے ہیں۔ اِسی وجہ سے انھوں نے اپنے کالموں میں وسط ایشیائی ملکوں کی معاشرت اور ثقافت کے بارے میں کافی جگہ اپنے قارئین کو قیمتی معلومات سے آگاہ کیا ہے خصوصاً اُن ملکوں سے مستفید ہونے والی طرح طرح کی خوراکوں سے اپنے قارئین کے ذہن و دہن کو بھی مسرور کیا ہے۔

محمد اظہار الحق چونکہ مذہبی گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں اِس لیے مذہب سے پیار اُن کی رگ رگ میں بسا ہوا ہے، اپنے مذہب سے اِس بے انتہا پیار کا اظہار وُہ اپنے کالموں میں کئی جگہ کرتے نظر آتے ہیں۔ محمد اظہار الحق اپنے آقا حضرت محمد ﷺ کی شان میں جب کچھ لکھتے ہیں تو کمال لکھتے ہیں، محبت اور عشق میں ڈوب کر لکھتے ہیں۔ اپنے ایک کالم "وَرَفعنا لک ذکرک" میں وُہ بیان کرتے ہیں کہ یورپ میں کیے گئے ایک سروے کے مطابق "محمد" دنیا کا مقبول ترین نام ہے اور اِس وقت دنیا میں پندرہ کروڑ افراد کا نام محمد ہے۔ محمد اظہار الحق کے بقول یہ تعداد پندرہ کروڑ سے کہیں زیادہ ہے بلاشبہ یہ نام پوری دنیا پر حکمرانی کر رہا ہے۔ صدیوں سے اس نام پر کرۂ ارض کے مرد، عورتیں، بوڑھے، جوان اور بچے درودِ پاک بھیج رہے ہیں۔ کتنے درود پڑھے گئے، کتنے سلام بھیجے گئے یہ صرف اُس پروردگار ہی کو معلوم ہے جس کے علم میں ریت کے ذرے، سمندر کے قطرے، کہکشاؤں کے ستارے، درختوں کے پتے اور انسانوں کی سانسیں ہیں۔ اِس نام کی تعریف آج تک کوئی نہیں کر سکا، جس نے بھی کیا، عجز اور بے بسی کا اظہار کیا۔ محمد اظہار الحق اپنے آقا کے ساتھ ساتھ اُن کے شہر

سے بھی بہت گہری محبت اور عقیدت رکھتے ہیں اور ہر مسلمان کو اپنے آقا سے اپنی جان، اولاد اور مال سے کہیں زیادہ محبت ہونی بھی چاہیے اور اُن کے شہر سے بھی پوری دنیا کے سب شہروں سے زیادہ الفت بلکہ عشق رکھنا چاہیے۔ محمد اظہار الحق نے اپنی کالم نگاری میں مسلم تہذیب و تمدن کا ذکر بہت تواتر کے ساتھ کیا ہے، انھوں نے اسلامی علوم و فنون کے وارث شہروں کا ذکر اپنی کالم نگاری میں بڑی محبت اور احترام کے ساتھ کیا ہے۔ بصرہ و بغداد اور سمرقند و بخارا کا تمدن اس کی محبتوں کا امین ہے۔ تہذیبوں کی تاریخ پر گہری نظر رکھنے والے محمد اظہار الحق نے ہماری تہذیبی متاع کے امین ان شہروں کو بلاشبہ اپنے لفظوں سے محبتوں کے ہالے میں پرو دیا ہے، میں سمجھتا ہوں یہ دراصل محمد اظہار الحق کی روحانی نسبتوں کی عظمتیں ہیں اور ایسی نسبتیں بڑی لجپال ہوتی ہیں جو زندہ رہتی ہیں اور زندہ رکھتی ہیں بلکہ زندہ تر بنا دیتی ہیں، ایک بستی جو بیماریوں کا گڑھ تھی اور یثرب کہلاتی تھی، محبوبِ کائنات، محمد ﷺ کے قدم جب اُس نے چوم لیے تو اُسی بستی کی مٹی خاکِ شفا ہو گئی اور ہر مرض کی دوا ہو گئی، محمد اظہار الحق کے تخلیقی سوتے اُسی خاکِ پاک کے تپاک سے پھوٹے ہیں۔ قریۂ مصطفےٰ ﷺ کے جمیل کوچوں کی ہوا محمد اظہار الحق کے تخلیقی عمل کی رہنما ہے۔ اُسی یثرب کی زمین پر آج سے تقریباً چودہ پندرہ سو سال پہلے ایک ابرِ رحمت برسا تھا اور اُس مٹی کی مہکار نے عالمِ انسانیت کو ابد نصیب بہار کا تحفہ عطا کر دیا تھا، لیکن ہم مردہ نصیب اُس بہار کے نکھار کو سنبھال نہ سکے اور ہمارا تہذیبی جمال اور تمدنی جلال ایک بے معاشرت ثقافت کے ملال میں گم ہوتا چلا گیا، یہاں تک کہ ہماری زندگی احساس ملامت کی شرمندگی میں کھو گئی۔ ایک سربلند اسلامی تہذیب کی گم شدہ سرشاریوں کا ملال محمد اظہار الحق کی کالم نگاری میں امید کے جمال کا خواب بنتا ہے اور ایک شادمان زیست کی تمنا اُس کے کالموں کا بنیادی محور و مرکز ٹھہرتی ہے۔ محمد اظہار الحق بہت مضبوط اور راسخ العقیدہ مسلمان ہیں جو اپنے خدا پر بہت پختہ ایمان رکھتے ہیں، مشکل سے مشکل مرحلے میں بھی اُن کا اپنے پروردگار سے یقین کم نہیں ہوتا ہے، اپنے اِس کامل یقین اور اپنے رب کی قدرت کا اظہار وُہ اپنی تحریروں میں بھی کرتے نظر آتے ہیں اور اِس چیز نے اُن کی کالم نگاری کے حسن کو مزید نکھار دیا ہے۔

صحافت کا سب سے پہلا اصول ہے کہ تحریر عام فہم ہو اور کم پڑھا لکھا انسان بھی آسانی سے سمجھ سکے۔ محمد اظہار الحق کی عام فہم نثر نے اردو صحافت کو نیا مقام عطا کرنے میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔ محمد اظہار الحق اپنے کالم "تلخ نوائی" میں ہمیشہ کڑوے سچ اور معاشرے میں موجود تلخ حقیقتوں سے اپنے قارئین کو آگاہی فراہم کرتے ہیں۔ اپنے کالموں میں وُہ جگہ جگہ ہمارے معاشرے کی اخلاقی اور مذہبی بیماریوں، گھناؤنے کرتوتوں اور حد سے

بڑھی انسانی بے حسی اور بے توقیری کا احوال بیان کرتے نظر آتے ہیں۔ محمد اظہار الحق کے کالموں کی زبان سادہ اور عام فہم سہی مگر اِس کی اثر آفرینی اور ادبی چاشنی سے انکار ممکن نہیں ہے۔ محمد اظہار الحق حالاتِ حاضرہ پر گہری نظر رکھتے ہیں، اُنھیں فکر ہے کہ آج کا نام نہاد مسلمان اِس حد تک گر چکا ہے کہ وُہ تقریباً تمام معاشرتی برائیوں اور اخلاقی بیماریوں کا شکار ہو چکا ہے۔ وُہ رمضان کے مقدس مہینے میں بھی اپنی منافقانہ روش تبدیل نہیں کر سکتا ہے، پوری دنیا میں ہر مذہب کے ماننے والے اپنے اپنے مقدس مہینوں کا احترام کرتے ہیں، اور اُن کے مقدس مہینوں میں اشیائے ضروریہ انتہائی ارزاں نرخوں پر عوام الناس کو فراہم کی جاتی ہیں مگر کتنا ستم ہے کے مسلمانوں کے مقدس ماہ میں صورتِ حال اِس کے بالکل برعکس ہوتی ہے اور اشیائے ضروریہ سستی ہونے کے بجائے دگنا بلکہ کئی بار اِس سے بھی زیادہ مہنگے نرخوں پہ عوام کو ملتی ہیں۔ محمد اظہار الحق اپنے کالموں میں امتِ مسلمہ کی زبوں حالی پر کڑھتے نظر آتے ہیں، وہ مسلمانوں کی عیش پرستی، بے عملی اور نا اتفاقی کو اُن کی اِس ناکامی اور رسوائی کا سبب سمجھتے ہیں۔ محمد اظہار الحق اپنے کالموں میں مسلمانوں میں نمود و نمائش اور دکھلاوے پر بھی تنقید کرتے ہیں، جو آج کل ہمارے معاشرے میں اکثر نظر آ رہے ہیں، وُہ اِس بات پر بہت کڑھتے نظر آتے ہیں کہ مسلمانوں نے اپنے دین کو بھی خالص نہیں چھوڑا ہے بلکہ اِس میں بھی تصنع اور بناوٹ کو شامل کر لیا ہے۔ آج کے مسلمان کا مقصدِ حیات دائمی اور اُخروی کامیابی کے بجائے محض دنیاوی دھن دولت کا حصول ہی رہ گیا ہے، اور دولتِ دنیا کے حصول میں آج کا مسلمان ہر اخلاقی اور مذہبی قدر کو کھو چکا ہے، وہ حد درجہ اخلاقی پستی میں گر چکا ہے اور انسانیت کے اعلیٰ وارفع مقام سے گر کر ذلتوں کی اتھاہ گہرائیوں میں پہنچ چکا ہے۔ محمد اظہار الحق نے اپنے مذہب کا درد محسوس کرتے ہوئے عہدِ حاضر کے تقریباً تمام دینی اور مذہبی مسائل اور پہلوؤں پر بھرپور اظہار خیال کیا ہے اور اپنے کالموں میں مذہبی موضوعات کو نمایاں جگہ دی ہے، اِسی وجہ سے مذہبی رجحانات رکھنے والے قارئین محمد اظہار الحق کی کالم نگاری کو پسند کرتے ہیں۔ محمد اظہار الحق بلاشبہ کالم نگاری کے میدان کے ایسے ہی شہسوار ہیں۔ انھوں نے نہ صرف قومی بلکہ کئی بین الاقوامی اخبارات میں بھی کالم لکھے ہیں اور جذباتی معاملات میں بھی کبھی بھی صبر کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دیا، نہ ہی انھوں نے کسی ایک خاص قوم یا پارٹی کا ساتھ دیا ہے، انھوں نے ہمیشہ ایمانداری اور پیشہ وارانہ دیانت داری اور کامل ذمہ داری سے جو حق سمجھا، بس وہی کچھ لکھا ہے۔ محمد اظہار الحق نے صرف اور صرف سچائی اور عوام کی فلاح کے لیے ہمیشہ صدائے حق بلند کی ہے اور اپنی پیشہ وارانہ دیانت اور صداقت کی وجہ سے وہ ہمیشہ ہر دلعزیز رہیں گے۔ محمد اظہار الحق نے اپنی کالم نگاری میں مذہب، سیاست، تاریخ، سماج، معیشت، معاشرت اور حالاتِ حاضرہ سب کو

بہت خوب صورتی اور مہارت کے ساتھ اتنے دلکش اور دلچسپ پیرائے میں اپنے کالموں میں سمویا ہے کہ اُن کا ایک عام قاری بھی اُن کی تحریر کے حسن سے بخوبی مستفید ہو سکتا ہے، اُن کے کالموں سے یہ بات بخوبی عیاں ہو جاتی ہے کہ ہماری سیاست کا براہِ راست اثر ہمارے سماج پر پڑتا ہے اور سماجی حالات کی تبدیلی کافی حد تک سیاسی اثرات اور سیاسی عوامل کے تابع ہوتی ہے۔ سماجی مسائل کی جڑیں سیاسی ناانصافیوں اور ناہمواریوں میں ہوتی ہیں اور سیاست کے بدلتے رُخ عوام کے رویوں اور اُن کی روزمرہ زندگی پر کافی حد تک اثر انداز ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ کے ہر عہد میں، ہر حکمران نے اپنی سیاسی حکمتِ عملی کے اثرات کا جائزہ لینے کے لیے اپنی عوام کے سیاسی حالات سے آگاہی کو ضروری سمجھا اور پھر بدلتے حالات کے تناظر میں اپنی پالیسیوں کا رخ عوام کی طرف موڑ دیا اور یہی ایک اچھے اور کامیاب حکمران کی نشانی ہے۔ محمد اظہار الحق گاہے بگاہے بیرونِ ملک بھی جاتے رہتے ہیں اور وہاں کے اپنے مشاہدات اور تجربات اپنی کالم نگاری کے ذریعے اپنے قارئین تک پہنچاتے رہتے ہیں، وہ بیرونی ممالک میں جو اچھی اور قابلِ تقلید چیز دیکھتے ہیں تو اُن کی کوشش ہوتی ہے کہ ہمارے عوام بھی اُس کو اپنا کر معاشرے کے زیادہ مفید اور سرگرم شہری بن سکیں اور اپنے وطنِ عزیز کو دنیا بھر میں ایک اچھا اور باعزت مقام دلا سکیں۔

محمد اظہار الحق اپنے کالموں میں اِس بات پر بہت کڑھتے نظر آتے ہیں کہ ہمارے دینی احکامات پر غیر مسلم تو عمل کر رہے ہیں اور انھوں نے اسلام کے سنہری اصولوں کو اپنا کر ایک مثالی انسانی معاشرہ تعمیر کر لیا ہے اور وہ انسانیت کے اعلیٰ معیار کو حاصل کر چکے ہیں، مگر ہم مسلمان خود ابھی تک اُن احکامات پر عمل درآمد کرنے سے کوسوں دور ہیں، جو معاشرے میں بہتری اور بھلائی کے لیے بنیادی حیثیت رکھتے ہیں، وہ جب اپنے کالموں میں مغرب اور اپنے ملک کی تہذیب اور ثقافت کا موازنہ پیش کرتے ہیں تو اہلِ مغرب کی اچھائیوں کے ساتھ ساتھ اپنے ہاں کی خامیوں کا بھی کھل کر ذکر کرتے ہیں۔ محمد اظہار الحق کے ہاں ذرا بھی منافقت نہیں ہے، اگر وہ کسی غیر مسلم میں کوئی خوبی یا اعلیٰ اخلاقی قدر دیکھتے ہیں تو وہ اُس غیر مسلم کی خوبی کا اعتراف بھی کھلے دل کے ساتھ کرتے نظر آتے ہیں اور یہی چیز محمد اظہار الحق کو اپنے ہم عصر کالم نگاروں سے نمایاں اور ممتاز کرتی ہے اور اُن کی کالم نگاری کی اثر آفرینی کو بڑھانے کا سبب بنتی ہے اور اُن کی کالم نگاری کو منفرد اور حقیقت سے قریب تر بناتی ہے۔ محمد اظہار الحق بلاشبہ حساس دل اور گہری نظر رکھتے ہیں چونکہ انھیں دنیا کے کئی ممالک میں جانے کا اتفاق

ہوا ہے اِس لیے انھوں نے وہاں کی خوراک، رسوم ورواج اور تہذیب و ثقافت کے بارے میں بہت دلچسپ مشاہدات کیے اور اُن کے بارے میں اپنے تاثرات خوبصورتی کے ساتھ بیان کیے ہیں اور اِس چیز نے اُن کی کالم نگاری کو زیادہ ہر دلعزیز و دلچسپ بنا دیا ہے۔

عہدِ نبوی ﷺ کے بعد خلفائے راشدین کے دورِ خلافت میں بھی اور بعد میں حضرت عمر بن عبد العزیز کے دورِ حکومت میں خصوصاً عوام کے مفادات کا پورا پورا خیال رکھا گیا مگر المیہ یہ ہے کہ آج چودہ سو سال سے زیادہ عرصہ گزر جانے کے بعد ہم مادی لحاظ سے تو ترقی یافتہ ہوتے جا رہے ہیں، مگر عوامی مفادات کی فراہمی روز بروز پست سے پست سطح پر آتی جا رہی ہے۔ محمد اظہار الحق جب اپنے کالموں میں اِس دکھ کو بیان کرتے ہیں تو اُن کا انداز دل میں اتر جانے والا ہوتا ہے اور دل کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتا ہے۔ محمد اظہار الحق اپنے کالموں میں ہمارے ملکی ہسپتالوں کی سہولیات اور ڈاکٹروں کا موازنہ غیر ملکی ہسپتالوں اور ڈاکٹروں سے کرتے ہیں تو اُن کو شدید مایوسی اور دکھ ہوتا ہے کہ ترقی کے مدارج طے کرتے وہ کس انتہا پر پہنچ چکے ہیں اور ہم ابھی تک کسمپرسی کی حالتِ زار سے نہیں نکل سکے ہیں۔ محمد اظہار الحق اپنے کالموں میں اپنا یہ دکھ بھی جگہ جگہ بیان کرتے نظر آتے ہیں کہ ہمارے ملک میں وسائل بھی موجود ہیں، نوجوانوں میں بہت زیادہ اہلیت بھی ہے مگر ہم پھر بھی ترقی کی دوڑ میں جدید دنیا سے بہت پیچھے ہیں، کیا ترقی اور جدید ترین سہولیات پر ہمارے ہم وطنوں کا کوئی حق نہیں ہے۔ محمد اظہار الحق اِس تعلیمی انحطاط اور تنزلی کا سبب خود مسلمانوں کو ہی سمجھتے ہیں، وہ اپنے کالموں میں یہ دکھ بیان کرتے ہیں کہ وقت کے بدلتے تقاضوں کے ساتھ مسلمانوں نے خود کو جدید علوم اور سائنسی تحقیق سے ہم آہنگ نہیں کیا ہے، یہی وجہ ہے کہ مسلمان آج دنیا بھر میں ترقی اور تحقیق کی دوڑ میں ترقی یافتہ ممالک سے بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ محمد اظہار الحق نے اپنی کالم نگاری میں سائنسی میدان میں مسلمانوں کی زبوں حالی کے بارے میں بھی کھل کر بات کی ہے۔ وہ مسلمانوں کی بے علمی اور بے عملی پر طنز کرتے ہوئے کئی جگہ اُن پر گہری چوٹ کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ اپنے کالموں میں یہ قومی المیہ بڑے کرب سے بیان کرتے ہیں کہ موجودہ عہد میں مجموعی ترقی کے حوالے سے آسٹریلیا ابھی تک یورپ اور امریکہ سے بہت پیچھے ہے، پھر بھی اگر اُس ملک میں عوامی فلاح اور مفادِ عامہ کا اتنا خیال رکھا جاتا ہے تو یورپ اور امریکہ تو اِس سے کہیں آگے ہیں، اُن

ممالک میں تو انسانی مفادات اور سہولیات کی سطح اور زیادہ بلند ہو گی جب کہ ہمارے ملک میں عوام کا پُرسانِ حال کوئی بھی نہیں ہے۔ ہم امریکہ تو دور ترقی میں آسٹریلیا سے بھی بہت پیچھے ہیں، ہمارے وطنِ عزیز میں کوئی ایک ادارہ بھی ایسا نہیں ہے جو عوام کے مفادات مکمل طور پر فراہم کر رہا ہو۔ نہ ہی صحت کے شعبے میں اور نہ ہی تعلیم کے شعبے میں عوام کو عالمی معیار کے عشرِ عشیر سہولیات حاصل ہیں۔ بے روزگاری عام ہے۔ سہولیاتِ زندگی تو دور کی بات عوام کو مکمل ضروریاتِ زندگی تک حاصل نہیں ہیں اور عوام کی اکثریت غربت کی لائن سے بھی نیچے کسمپرسی اور ذلت کی غیر انسانی زندگی گزار رہی ہے جو ہمارے لیے بحیثیتِ قوم لمحۂ فکریہ ہے اور بطورِ انسان ڈوب مرنے کا مقام ہے۔ محمد اظہار الحق نے اپنی کالم نگاری میں وطنِ عزیز سے باہر رہنے والے دانش وروں اور سائنس دانوں کی بھی کھل کر تعریف کی ہے اور اُن کے بارے میں اپنے کالموں میں بہت نمایاں طور پر لکھا ہے، چاہے وہ دنیا کے جس حصے میں بھی رہتے ہوں اور کسی ملک کے لیے بھی اپنی خدمات سرانجام دے رہے ہوں۔ اسی طرح محمد اظہار الحق نے اپنے کالموں میں پاکستانیوں اور مسلمانوں کی طرف سے کیے جانے والے اچھے تحقیقی کاموں کی بھی بھرپور تعریف کی ہے۔

محمد اظہار الحق اپنے والدین سے بڑی محبت کرتے تھے اور حد درجہ اُن کا احترام کرتے تھے، اُنھوں نے اپنی کالم نگاری میں والدین کے بلند مقام اور اعلیٰ مرتبے کا کئی جگہ ذکر کیا ہے ایک جگہ وہ والد کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ کوئی گوشت پوست کا بنا ہوا انسان یہ بات تو برداشت ہیں نہیں کر سکتا کہ ایک دوسرا شخص اُس پر کسی قسم کی سبقت لے جائے مگر باپ پورے کرۂ ارض پر وہ واحد شخص ہوتا ہے جو چاہتا ہے کہ اُس کا بیٹا لیاقت اور ذہانت میں اور دنیاوی مناصب میں اور اخروی درجات میں اُس سے بھی آگے بڑھ جائے اور ماں کی شان اور مرتبہ تو اِس سے کہیں اعلیٰ و ارفع ہے، محمد اظہار الحق اپنی کالم نگاری میں اپنے قارئین کو یہی پیغام دیتے نظر آتے ہیں کہ اگر دنیاوی اور اخروی کامیابی چاہتے ہیں تو حتیٰ الوسع اپنے والدین کی خدمت کرو اور اِس سعادت کے ثمر اور فیض سے دنیا پہ چھا جاؤ۔ محمد اظہار الحق اپنی اِس خوش بختی پر بہت نازاں اور فرحاں ہیں کہ انھیں اُن کے والدین خصوصاً اُن کے والدِ محترم نے ہر ہر سانس بسر کرنے کا سبق دیا اور قدم قدم پر اُن کی رہنمائی کی، اپنی اِس بے پایاں خوشی کو محمد اظہار الحق اپنی اکثر تحریروں میں، اپنے کالموں میں، اپنے قارئین سے بانٹتے

نظر آتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ماں باپ تو سایہ دار درخت کی طرح ہوتے ہیں جو ہر کٹھن گھڑی میں، آزمائش کی تپتی دھوپ میں گھنا سایہ بن کر اولاد کو ٹھنڈی چھاؤں فراہم کرتے ہیں۔ جیسے ہی یہ سایہ دار درخت انسان کی زندگی سے غائب ہوتا ہے۔ یہ طلسمی مافوق الفطرت خوبصورت پرندے انسان کی زندگی سے رخصت ہو جاتے ہیں، دوسری دنیاؤں سے اُس کے رابطے ٹوٹ جاتے ہیں پھر اُسے ان ساری سختیوں اور بے مہریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے جو اِس دنیا سے مختص ہیں۔ محمد اظہار الحق اپنے کالموں میں نوجوان نسل کو بار بار یہ درس دیتے نظر آتے ہیں کہ اللہ کے بندو! تم میں سے جن کے ماں باپ سلامت ہیں، ان کی قدر کرو، خدارا جنت کا یہ ٹکٹ اپنے ہاتھ سے نہ گنواؤ، اگر وہ ناراض ہیں تو اُن کو لازمی طور پر راضی کر لو۔ محمد اظہار الحق اپنی کالم نگاری میں اپنے قارئین کو یہ پیغام بھی دیتے ہیں کہ ہر انسان اور خاص طور پر امتِ مسلمہ کا ہر فرد اپنے اندر صلہ رحمی، عفو و درگذر، خوش اخلاقی، رواداری اور مثبت تاویل کرنے کے اوصافِ حمیدہ نہ صرف پیدا کرے بلکہ اُنھیں صرف اپنی ذات تک محدود نہ رکھے بلکہ ایک مشن کے طور پر اُن کا پرچار کرے، انھیں عملاً زیادہ سے زیادہ پھیلائے۔ لاتعداد افراد، خانوادوں اور گروہوں کو جو ایک دوسرے سے تعلقات منقطع کیے ہوئے ہیں اور باہم برسرِ پیکار ہیں، اپنے سب جھگڑے اور دلوں کی سب کدورتیں دور کر دیں اور ایک دوسرے کو گلے لگا لیں۔

اچھے صحافی کی یہ خوبی ہوتی ہے کہ وہ صحافت کے فن کو مدِ نظر رکھتے ہوئے معیاری تحریر پیش کرے اور ایسی ہی معیاری تحریریں آگے چل کر ادب میں شامل ہو جاتی ہیں۔ اور محمد اظہار الحق کی تحریریں بھی بلاشبہ ایسی ہی دِل کو موہ لینے والی ہوتی ہیں اور اُن کے قارئین کی اکثریت اُن کے ایسے بے مثال کالموں کو کافی پسند کرتی ہے۔

محمد اظہار الحق بلاشبہ منفرد اور عہد ساز کالم نگار ہیں، اُن کی تحریریں اپنے اندر ایسی دلکشی اور انفرادیت کا ایک جہان لیے ہوئے ہوتی ہیں، جو اپنے قاری کو اپنے سحر میں جکڑ لیتی ہیں۔ محمد اظہار الحق اپنے کالموں میں کہیں کہیں یہ دکھ بھی شدت کے ساتھ بیان کرتے نظر آتے ہیں کہ اِس ملکِ عزیز نے تو ہر کسی کے ساتھ وفا کی ہے، ہر دکھی کا درد بانٹا ہے، ہر آرزومند کی آرزؤں اور امیدوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا ہے مگر بدلے میں اکثریت نے اِس دھرتی کے ساتھ وفا نہیں کی ہے، کوئی اِس ملکِ عزیز کو دولخت کرنے کی سازش میں شریک رہا ہے تو کوئی اب بھی اِس کی آزاد فضاؤں میں سانسیں لینے کے باوجود اِس پاک وطن سے، اِس مقدس دھرتی سے

بدستور شکوہ کناں ہی نظر آتا ہے، جو اِس وطنِ عزیز کے ساتھ سراسر زیادتی ہے۔ اِس پاک دھرتی کا المیہ یہ بھی ہے کہ یہاں بسنے والے یہ تو بھولتے جارہے ہیں کہ ہمارا وطنِ عزیز دنیا کی وہ واحد اسلامی ریاست ہے جو اسلام کے نام پر قائم ہوئی ہے۔ وفات سے کچھ عرصہ پہلے بانیٔ پاکستان قائداعظم محمد علی جناحؒ نے اِس اسلامی ریاست، مملکتِ خداداد پاکستان کے قیام کا ذکر اور خداوندِ بزرگ و برتر کی اِس بے پایاں رحمت پر سجدۂ شکر ادا کرتے وقت فرمایا تھا کہ کیا کسی قوم پر اِس سے بڑھ کر خدا کا کوئی اور انعام ہو سکتا ہے؟ یہی وہ "خلافت" ہے جس کا وعدہ خدا نے رسولِ اکرم ﷺ سے کیا تھا کہ اگر تیری امت نے صراطِ مستقیم کو اپنے لیے منتخب کر لیا تو ہم اسے زمین کی بادشاہت دیں گے۔ خدا کے اِس انعامِ عظیم کی حفاظت اب مسلمانوں کا فرض ہے، پاکستان تحفۂ خداوندی ہے اور اِس "تحفہ" کی حفاظت ہر پاکستانی مرد، عورت، بچے، بوڑھے اور جوان پر فرض ہے مگر ہماری اکثریت اپنے اِس فرض سے غافل ہو چکی ہے، جو اِس پاک دھرتی کے ساتھ بڑی زیادتی بلکہ ظلمِ عظیم ہے اور ساتھ ساتھ کفرانِ نعمت بھی ہے۔ ہم اہلِ پاکستان کی بہت بڑی بدقسمتی ہے کہ ہم اِس تحفۂ خداوندی کی ٹھیک طرح سے قدر نہیں کر سکے ہیں اور آج اسلامی دنیا کی واحد ایٹمی طاقت ہونے کے باوجود ہم دنیا بھر میں ذلیل اور خوار ہو رہے ہیں، ہم پاکستانی بے وُقعت اور کم تر سمجھے جاتے ہیں جو اپنا کاسۂ گدائی بھیلائے دنیا کے کونے کونے میں بدنام ہو چکے ہیں۔ دوسری طرف ہمارے حکمرانوں نے ملکی دولت لوٹ لوٹ کر غیر ملکی بنک اور تجوریاں بھر رکھی ہیں بلکہ دن بدن اُن کے سرمائے میں اور وطنِ عزیز کے قرضوں میں بے پناہ اضافہ ہو رہا ہے، اور یہ قرض ہماری آنے والے نسلوں نے چکانے ہیں، بلکہ اب بھی ہم اِن کو سود سمیت چکا رہے ہیں۔ محمد اظہار الحق کی کالم نگاری سے امید اور حوصلہ مندی کا درس ملتا ہے، انھوں نے اپنے قارئین کو ہمیشہ مثبت سوچ فراہم کی ہے، وُہ ملکی معاشی حالات کی بہتری کے لیے کوشاں لگتے ہیں۔ محمد اظہار الحق نے چونکہ معاشیات میں ماسٹر ڈگری حاصل کر رکھی ہے، اِس لیے ملک کے معاشی معاملات کو دیگر کالم نگاروں اور صحافیوں کی نسبت وہ بہتر انداز میں سمجھتے ہیں اور اُن پر جامع اور مستند تبصرہ کر سکتے ہیں، وُہ دل سے خواہش رکھتے ہیں کہ عام آدمی بہتر زندگی سے مستفید ہو اور اُسے تمام لازمی ضروریاتِ زندگی کی آسان اور یقینی فراہمی ممکن ہو۔

محمد اظہار الحق اپنے کالموں میں ہمیں بتاتے رہتے ہیں کہ ہمارے ہم وطنوں کو پتہ ہی نہیں ہے کہ ہمارا وطنِ عزیز کس قدر خوبصورت اور حسین ہے، یہ پاک دھرتی اللہ پاک کا انمول عطیہ ہے۔اِس میں بلند و بالا پہاڑ، فلک بوس برفانی چوٹیاں، زور و شور سے بہتے دریا، زرخیز میدان، نہری و بارانی علاقے، صحرا و جنگلات، جھیلیں اور سمندر سب کچھ موجود ہے۔ پھر ہر قسم کا موسم اور انواع و اقسام کے پھل اور فصلیں اللہ پاک نے ہمیں مہیا کر رکھی ہیں، مگر ہم اہلِ پاکستان بڑے بد قسمت اور بد نصیب ہیں۔ محمد اظہار الحق اپنے کالموں میں یہی دُکھ بیان کرتے ہیں کہ ہم نااہل ہیں۔ اگر ہمارے اربابِ اختیار ذرا بھی قابل ہوتے تو سیاحت سے کروڑوں کیا، اربوں کما سکتے تھے اور ہمارے ملک کا ذکر بالی، سوئٹزرلینڈ اور اُن یونانی اور ہسپانوی جزیروں کے ساتھ ہوتا، جہاں سال کے بارہ ماہ، سیاحوں کا ہجوم رہتا ہے۔ لیکن سیاحت ایک انڈسٹری ہے اور انڈسٹری، سہولیات مانگتی ہے، مگر ہمارے نااہل حکمران سیاحوں کو کوئی بھی سہولت فراہم کرنے میں سراسر ناکام ہیں۔ محمد اظہار الحق اپنی کالم نگاری میں بار بار اپنا یہ دکھ قارئین کے سامنے رکھتے ہیں کہ ہمارا وطنِ عزیز بلاشبہ بہت حسین ہے، اِس کے دلکش مناظر ایسے ہیں گویا کہ زمین پر جنت اُتر آئی ہو مگر ہماری بہت بڑی بد قسمتی ہے کہ جِن ملکوں کے پاس اِس حسن کا عشرِ عشیر بھی نہیں جو قدرت نے شمالی علاقوں کی شکل میں پاکستان کو دیا ہے، اُن ملکوں نے سیاحت سے پوری دنیا کو اپنی طرف کھینچ لیا ہے اور ہم اِس انتظار میں ہیں کہ آسمان سے فرشتے اتریں، ہماری سیاحت کی صنعت کو ترقی دیں اور پھر پلیٹ میں رکھ کر ہماری خدمت میں پیش کریں۔ ہمیں خوابِ غفلت سے جاگنا ہو گا اور اگر ہم حقیقت میں اپنے ملک میں سیاحت کی صنعت کا فروغ چاہتے ہیں تو ہمیں خلوصِ دِل سے اور پوری لگن سے کام کرنا ہو گا اور سیاحت کے شعبے کو ہر ممکن سہولیات فراہم کرتے ہوئے اِسے بامِ عروج تک پہنچانا ہو گا تبھی اِس صنعت سے ہم حسبِ خواہش نتائج حاصل کر سکیں گے۔

محمد اظہار الحق معاشرے میں موجود ہر قسم کے سماجی مسائل کو اپنے کالموں میں قارئین کے سامنے اجاگر کرتے رہتے ہیں، چاہے وہ بیٹیوں کے ساتھ روا رکھا جانے والا امتیازی سلوک ہو، کاروکاری یا ونی جیسی گھناؤنی رسمیں ہوں، ہمارے عدالتی نظام کی خرابی ہو یا انصاف کی عدم فراہمی، رشتوں کی ناقدری ہو یا دولت کی ہوس، لسانی تعصبات ہوں یا معاشرتی اقدار کی تنزلی، اخلاقی پستی ہو یا سماجی بے راہ روی۔ محمد اظہار الحق نے سلگتے

معاشرتی مسائل اور مسلمانوں کی پست اخلاقی حالت پر اکثر کالموں میں کچھ نہ کچھ لازمی لکھا ہے۔ محمد اظہار الحق نے روز مرہ زندگی اور عوامی دلچسپی کے عام موضوعات پر لکھا ہے اور جس موضوع پر قلم اٹھایا ہے، اپنی علمی اور صحافتی مہارت سے اُسے خاص بنا دیا ہے۔ اسی وجہ سے محمد اظہار الحق کے کالم عام فہم اور حقیقت سے قریب تر ہونے کی وجہ سے قارئین میں بڑے پسند کیے جاتے ہیں۔ انھوں نے کبھی اپنے ضمیر کے خلاف کچھ نہیں لکھا، انھوں نے جو کچھ سچ سمجھا، وہی کچھ لکھا اور ہمیشہ صحافت کے تقدس کا خاص خیال رکھا۔ محمد اظہار الحق کی کالم نگاری کا نمایاں ترین وصف یہ ہے کہ انھوں نے کبھی کسی فرد کی خوشنودی کے خیال سے کچھ نہیں لکھا، ہمیشہ قلم کی حرمت کا پاس رکھتے ہوئے تلخ ترین سچ ہی لکھا ہے، چاہے وہ حاکمِ وقت کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ محمد اظہار الحق نے ہمیشہ اصولوں کی صحافت کی ہے، انھوں نے ہمہ وقت صحافت کے درخشاں اصولوں پر کاربند رہ کر صحافت میں اپنا رُخ متعین کیا اور غیر جانب دارانہ اور بے باک صحافت میں اپنی منفرد پہچان بنائی ہے اور سنجیدہ صحافتی حلقوں میں بڑا نام کمایا ہے، ہم موجودہ دور کو بلاشبہ محمد اظہار الحق کی بے مثال صحافت کا سنہری دور کہہ سکتے ہیں۔ محمد اظہار الحق اردو کالم نگاری میں اپنے منفرد اظہار کے حوالے سے ایک جداگانہ اور برتر مقام کے حامل ہیں۔ اللہ تبارک و تعالیٰ سے دعا ہے کہ کالم نگاری کے میدان میں اُن کے بیان کی سادگی اور تازگی ہمیشہ برقرار رہے اور وہ اپنے قارئین کے دلوں اور ذہنوں پہ ہمیشہ راج کرتے رہیں اور اپنی کالم نگاری سے اصلاحِ معاشرہ کا اہم فریضہ بخوبی سر انجام دیتے رہیں اور اپنی معیاری تحریروں سے اردو زبان و ادب کی بھرپور خدمت کرتے رہیں۔

محمد اظہار الحق کی کالم نگاری کے بارے میں چند ہم عصر کالم نگاروں اور ادیبوں کی آراء

کالم نگاری میں محمد اظہار الحق کی انفرادیت اور ادبی افادیت کے تعین کے لیے چند ہم عصر کالم نگاروں اور ادیبوں کی آراء کو شامل کیا جارہا ہے، ملاحظہ کیجئے۔

ا۔ کالم نگار سعود عثمانی کی رائے:

عصرِ حاضر کے معروف کالم نگار سعود عثمانی اردو اخبار "روزنامہ 92 نیوز" میں اپنا کالم "دل سے دل تک" کے عنوان سے لکھتے ہیں، اپنے ایک کالم "اس اوج پہ میں اسم کی تاثیر سے پہنچا" میں وہ محمد اظہار الحق کی کالم نگاری کے بارے میں تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"محمد اظہار الحق وہ بے مثل شخص ہے جس نے شاعری کو بھی ایک نئے ذائقے سے متعارف کرایا اور نثر کو بھی۔ جہاں تک ان کی تخلیقی جہات ہے، وہ غزل، نظم اور نثری نظم کے جانے مانے شاعر تو ہیں ہی لیکن بطورِ کالم نگار بھی ان کا نام اہم کالم نگاروں میں شامل ہوتا ہے۔ انھوں نے جس تواتر سے اور جس تخلیقی نثر کے ساتھ کالم لکھے ہیں اُس کی مثالیں لمحہءِ موجود میں کم کم ہیں، تواتر کا معاملہ یہ ہے کہ لوگ مسلسل لکھتے لکھتے تھک جاتے ہیں لیکن مجھے اظہار صاحب کے معاملے میں یہ لگتا ہے کہ اگر وُہ نہ لکھیں تو تھکنے لگیں گے۔ وہ تخلیق سے توانائی پیدا کرنے والے انسان ہیں اور پھر اسی توانائی سے دوبارہ تخلیق کرتے ہیں۔ محمد اظہار الحق کے سیاسی اور سماجی کالم اپنی جگہ لیکن جہاں جہاں وہ ذاتی حوالوں سے کالم لکھتے ہیں اپنا اور دوسروں کا دل نکال کر رکھ دیتے ہیں، اپنی لاڈلی بیٹی کی رخصتی پر تحریر ہو یا اپنے پوتوں، پوتیوں کی جدائی پر، اُن کا اثر ہی الگ ہے چنانچہ اُن کی ایسی تحریروں کا مجھے خاص طور پر انتظار رہتا ہے"۔

بحوالہ

کالم سعود عثمانی

بدھ تیرہ ستمبر 2017ء

روزنامہ 92 نیوز

''اس اوج پہ میں اسم کی تاثیر سے پہنچا''

آج بے ساختہ دل چاہ رہا ہے کہ اس شخص کو داد دی جائے جس نے شاعری کو بھی ایک نئے ذائقے سے متعارف کروایا اور نثر کو بھی۔ ایک کالم کی پونجی اگرچہ اتنے ساز و سامان کے لیے بالکل ناکافی ہے لیکن دل صاحب کا کیا کیا جائے جو یہ مان کر ہی نہیں دیتے۔ ان حضرت نے صبح صبح کہیں وہ غزل پھر ایک بار پڑھ لی جو بہت بار پہلے بھی پڑھ چکے ہیں اور اب مصر ہیں کہ اس شخص کے بارے میں فوراً کچھ لکھو جس پر تم بہت مدت سے لکھنے کا ارادہ کیے بیٹھے ہو۔ خیر اس ضدی سے تو میں نمٹتا ہوں لیکن آپ کو بھی اس غزل کے کچھ شعر بہر حال سنانے کو جی چاہ رہا ہے۔

سفید ریشم کی اوڑھنی میرے ہاتھ میں تھی
مگر اسے داغدار میں نے نہیں کیا تھا
سموں تلے روندے خوشی سے مگر یہ ان سے
گناہ اے شہسوار میں نے نہیں کیا تھا
غروب کا وقت تھا مقرر سو چل پڑا میں
کسی کا پھر انتظار میں نے نہیں کیا تھا

یہ غزل جیسا کہ بہت سے دوست جانتے ہیں جناب محمد اظہار الحق کی ہے۔ اعلیٰ شاعر، منفرد نثر نگار اور میرے سینئر پیارے دوست اظہار الحق۔ ان کی شاعری کا سوچوں تو کبھی ان کا یہ مصرعہ یاد آتا ہے کہ ؎

کنارے پہ تو چل رہی ہے تری روشنی اڑ رہی ہے

اور کبھی یہ شعر

کبھی پلکیں سونے کے ذرے، کبھی جھلکے مرغابی کا لہو
کئی پیالے کب سے کھڑے ہیں مگر پانی ختم نہیں ہوتا

لیکن حافظے پر زور دوں تو یاد آتا ہے کہ جناب اظہار الحق کا یہ شعر سب سے پہلے پڑھا تھا اور پڑھتے ہی یاد ہو گیا تھا۔

چلی شب ماہ دھیرے دھیرے سحر کی جانب
رواں ہو چاندی کی ناؤ جیسے بھنور کی جانب

دل سے دل تک

سعود عثمانی

saud.usmani@gmail.com

اچھے شعر کی پہچان یہ بھی بتائی گئی ہے کہ وہ پڑھتے ہی فوراً یاد ہو جائے اور وہ زمانہ تو تھا بھی ایسا کہ شعر پڑھنے کی ہر وقت ایک للک سی رہتی تھی۔ کلاسیکی شعراء کو پڑھ کر آنے والے پر جدید شعراء کے طلسمات کھل رہے تھے۔ وہ زمانہ بے صبری کا ہوا کرتا ہے۔ بس جو کچھ کل ملنا ہے وہ آج ہی حاصل ہو جائے۔ اسی بے صبری میں اظہار صاحب کا پہلا مجموعہ ''دیوارِ آب'' خریدا اور پڑھا۔ یہ طلسمات کا ایک اور جہان تھا۔ موضوعات سے لفظیات تک ایک الگ دنیا۔ دیوارِ آب کو 1982ء کا آدم جی ایوارڈ ملا جو اس زمانے کا وقیع ترین اعزاز تھا۔ پھر ''غدر'' چھپ کر آئی اور اس نے دھوم مچائی۔ ''پری زاد'' اور ''پانی پہ بچھا تخت'' اسی منفرد اور دلکش اسلوب کے مزید تر جہان مجموعے بن کر بعد میں ہاتھوں میں آئے لیکن یہ تو بعد کی باتیں ہیں۔ میں تو ابھی اس زمانے میں ہوں جب اظہار صاحب سے ایک ملاقات بھی نہیں تھی لیکن ان کی شاعری ایک الگ باغ کی سیر کی طرح تھی۔ ہم کچھ دوست یہ غزلیں پڑھتے تھے اور ایک دوسرے کو سناتے تھے۔ اور ان میں یہ شعر بھی تھا ؎

شہتوت کا رس تھا نہ غزالوں کے پرے تھے
اس بار بھی میں جشن میں تاخیر سے پہنچا

غزل میں یہ ایک مختلف لہجہ تھا جس میں نام لیے بغیر بھی جنگلوں اور گھوڑوں کے پانوں کی مٹھاس اور مہک تھی۔ ایرانی اور ترکستانی ہواؤں کی خوشبو جھلکتی تھی اور ایک رہ گزر غرناطہ اور قرطبہ کے گلی کوچوں میں اس طرح پھرتی تھی کہ وادی الکبیر اور سیرا نوادا نظروں کے سامنے رہتے تھے۔ یہاں اساطیری روایات و تلمیحات، مسلم تہذیبی اور تمدنی خطوں کی سیر کے ساتھ ایک گداز میں گندھ کر غزل کے کلام میں ڈھلی تھیں۔ مزے کی بات یہ کہ یہ روایتی شاعری سے بالکل الگ اور متوازی غزل تھی لیکن اسی کے ساتھ ساتھ روایتی غزل کا حزن پوری طرح اس میں خون کی طرح رواں تھا۔

یہ 1994ء کے قریب کی بات ہے۔ جب میرا تعارف باکمال شاعر دوست اور فارسی کے عالم ڈاکٹر معین نظامی سے ہوا اور بہت جلد یہ تعارف دوستی میں بدل گیا۔ معین کا رابطہ بلکہ ملاقاتیں اظہار الحق صاحب سے پہلے سے تھیں جس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ فارسی اور شاعری دونوں کی مشترک میراث میں شامل تھیں۔ انہی دنوں معین کے ساتھ اسلام آباد کے ایک سفر میں ہم نے اظہار صاحب کے دفتر میں ان سے ملاقات کی۔ اظہار صاحب شاید ان دنوں ملٹری اکاؤنٹس میں ڈپٹی آڈیٹر جنرل تھے۔ اپنی اس طبعی جھجک کے باوجود جو نامور اور بڑے لوگوں سے ملنے میں مجھے ہمیشہ ہوا کرتی ہے، مجھے ان سے ملنے کا اشتیاق تھا۔ اظہار الحق بہت محبت سے ملے اور اسی شام کو اپنے گھر پر ہمارے لیے کچھ دوستوں کے ساتھ شعری نشست اور عشائیے کا اہتمام کیا۔ یہ یادگار نشست تھی جس میں ڈاکٹر وحید احمد، رؤف امیر مرحوم، احمد داد آکاش اور چند دیگر دوستوں سے بھی میری پہلی ملاقات ہوئی۔ یہ سلسلہ اور تعلق اس طرح آگے بڑھا کہ بعد میں اظہار صاحب جب بھی لاہور آتے تو مجھے، معین نظامی اور طرح دار شاعر دوست ڈاکٹر شعیب احمد کو اطلاع ضرور دیتے اور مختلف جگہوں پر بہت مزے کی بے تکلف نشستیں ہوتی تھیں۔ اکثر یہ محفلیں لاہور کینٹ کی اس سرکاری قیام گاہ پر ہوتی تھیں جہاں اظہار صاحب کا قیام ہوتا تھا۔ میں ماہ و سال کے اس تسلسل میں اظہار صاحب کی وضع داری اور روایات کی پاسداری کا مشاہدہ کرتا رہا۔ انہوں نے اپنے بچوں کی شادیوں کے موقعے پر مجھے یاد رکھا اور میرے دکھ سکھ میں بھی ہمیشہ شریک ہوتے رہے۔ ان کے گھرانے سے میرے گھرانے کا قریبی تعلق استوار ہو چکا تھا چنانچہ اب تک میں ان سے ذاتی معاملات بھی بے تکلف ذکر کر دیتا ہوں اور ان سے مفید مشورے اور معاونت حاصل ہو جاتی ہے۔

مجھے بہت سی نامور ادبی شخصیات سے قریبی ربط ضبط کا موقع بھی ملا ہے لیکن اظہار صاحب ان معاملات میں بہت منفرد ہیں اور دوستی اور تعلق جس طرح وہ نبھاتے ہیں اس کی کوئی مثال میرے ذہن میں نہیں ہے۔ انہوں نے ہمیشہ مجھے بہت عزیز رکھا جس کا لازمی نتیجہ میری گستاخیاں اور کئی موقعوں پر اختلاف تھا جس کا میں کبھی کبھی مرتکب ہوتا رہا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ کسی تعلق میں اگر سچ نہ آئے تو اس کی پائیداری مشکوک ہی رہتی ہے اور جو رشتہ اس میں سرخرو ٹھہرے اسے کوئی نہیں ہلا سکتا۔ اس لحاظ سے بھی میری اور ان کی دو طرفہ محبت پر کئی مہریں ثبت ہیں۔ اپنی تحریروں میں انہوں نے کئی بار محبت سے میرا ذکر کیا۔ ایک غیر معمولی مضمون میری شاعری پر لکھا جسے میں اپنی شاعری پر چند بہترین مضامین میں سے ایک سمجھتا ہوں۔ میں نے کالم نگاری میں قدم رکھا تو انہوں نے بہت مفید مشورے دیے جو ان کے خلوص اور خیر خواہی کے گواہ تھے۔

سچ یہ ہے کہ میں اس تحریر میں اظہار الحق کے تخلیق کار کی مختلف جہات پر بات کرنا چاہتا تھا لیکن بات ذاتی تعلق کی طرف مڑ گئی۔ لیکن یہ بھی اپنی جگہ درست ہے کہ بطور دوست ان کا ذکر نہایت ضروری تھا۔ اس کے بغیر یہ بات بتانا بھی مشکل تھی کہ مجھے گزشتہ پچیس سال میں انہیں بطور دوست بھی قریب سے دیکھنے اور سراہنے کا موقع ملا ہے۔ جہاں تک ان کی تخلیقی جہات کا تعلق ہے وہ غزل، نظم اور نثری نظم کے جانے مانے شاعر تو ہیں ہی لیکن بطور کالم نگار بھی اہم ناموں میں شامل ہیں۔ انہوں نے جس تواتر سے اور جس تخلیقی نثر کے ساتھ کالم لکھے ہیں اس کی مثالیں اردو کالم میں کم کم ہیں۔ تواتر کا معاملہ یہ ہے کہ لوگ مسلسل لکھتے لکھتے تھک جاتے ہیں لیکن مجھے اظہار صاحب کے معاملے میں یہ لگتا ہے کہ اگر وہ نہ لکھیں تو تھکنے لگیں گے۔ وہ تخلیق سے توانائی پیدا کرنے والے انسان ہیں اور پھر اسی توانائی سے دوبارہ تخلیق کرتے ہیں۔ سیاسی اور سماجی کالم اپنی جگہ لیکن جہاں جہاں وہ ذاتی حوالوں سے کالم لکھتے ہیں، اپنا اور دوسروں کا دل نکال کر رکھ دیتے ہیں۔ اپنی لاڈلی بیٹی کی رخصتی پر تحریر ہو یا اپنے پوتوں پوتیوں کی جدائی پر، ان کا اثر ہی الگ ہے چنانچہ ان کی ایسی تحریروں کا مجھے خاص طور پر انتظار رہتا ہے۔

اچھا تو دل صاحب! تم نے ہمیشہ کی طرح اپنا کہا منوا لیا۔ کیا تمہیں پتا تھا کہ ایک پونجی میں کتنا سامان باندھا جا سکتا ہے۔ سو وہی ہوا۔ لیکن چلو خوش ہو؟ خوش تو میں بھی بہت ہوتا اگر اظہار صاحب کا یہ شعر سامنے نہ آ گیا ہوتا۔

مرے ہنر کی تجھے احتیاج کیا ہوگی
کہ میں زمانے ہی گزرے ہوئے بناتا ہوں

2۔ پروفیسر ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد کی رائے:

عصرِ حاضر کے معروف محقق، شاعر اور پروفیسر ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد محمد اظہار الحق کی کالم نگاری کے بارے میں، میرے پوچھے گئے سوالوں کے جواب میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے، اپنے تاثرات کچھ یوں قلم بند کرتے ہیں:

"محمد اظہار الحق کی کالم نگاری بھی اُن کی شاعری کی طرح انفرادیت کی حامل ہے۔ موضوعات کی ندرت، بیان کی دل کشی اور اسلوب کی سحر کاری انھیں معاصر کالم نگاروں سے ممتاز کرتی ہے۔ اُن کے کالموں میں داستان کی حیرت، افسانے کی شگفتگی اور شاعری کی لطافت گندھی ہوئی ہے۔ اِنھی اوصاف کی بدولت اُن کے کالم تخلیقی نثر کی اقلیم میں داخل ہو جاتے ہیں۔ وُہ سیاسی، سماجی، مذہبی، تہذیبی، علمی، ثقافتی اور ادبی موضوعات پر یکساں مہارت اور قدرت کے ساتھ کالم لکھتے ہیں، جس سے اُن کے مطالعے کی وسعت اور بوقلمونی کا اظہار ہوتا ہے۔ میری نظر میں اُن کا کالم اپنے رنگ و آہنگ اور ذائقے میں جو امتیاز رکھتا ہے، وُہ معاصر کالم نگاروں سے یکسر مختلف ہے"۔

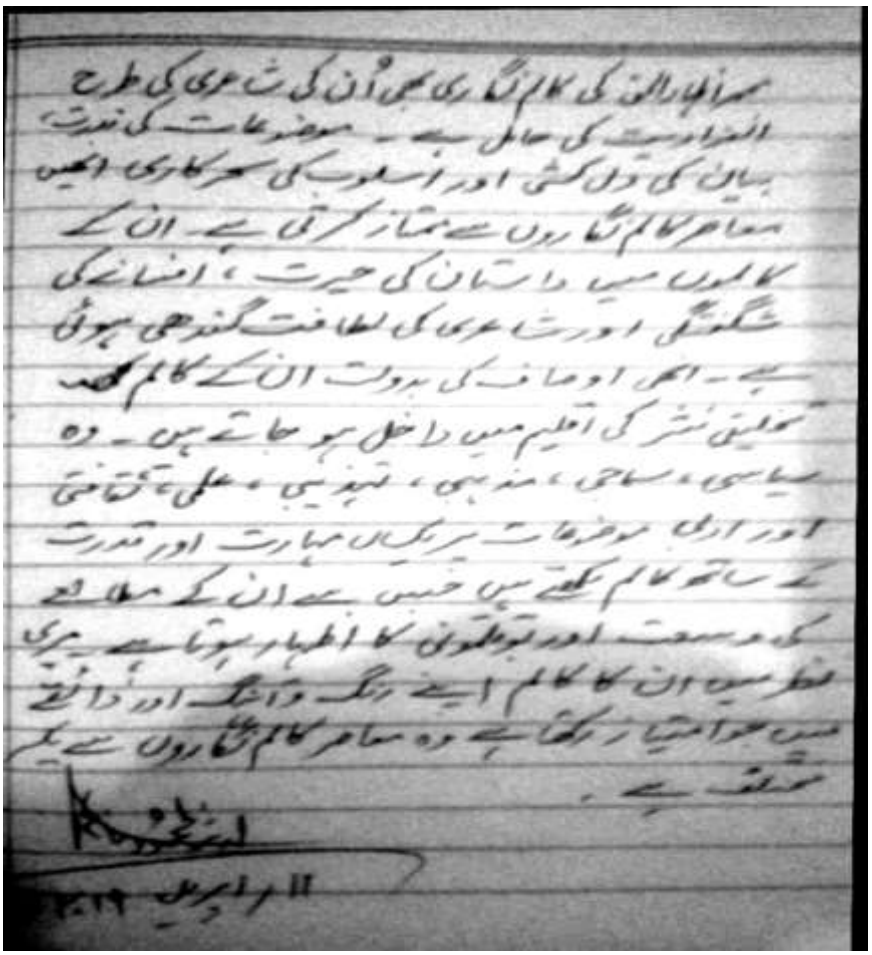
محمد اظہار الحق کی کالم نگاری بھی اُن کی شاعری کی طرح
انفرادیت کی حامل ہے۔ موضوعات کی ندرت،
بیان کی دل کشی اور اسلوب کی سحر کاری انھیں
معاصر کالم نگاروں سے ممتاز کرتی ہے۔ اُن کے
کالموں میں داستان کی حیرت، افسانے کی
شگفتگی اور شاعری کی لطافت گندھی ہوئی
ہے۔ اِنھی اوصاف کی بدولت اُن کے کالم تخلیقی
نثر کی اقلیم میں داخل ہو جاتے ہیں۔ وُہ
سیاسی، سماجی، مذہبی، تہذیبی، علمی، ثقافتی
اور ادبی موضوعات پر یکساں مہارت اور قدرت
کے ساتھ کالم لکھتے ہیں جس سے اُن کے مطالعے
کی وسعت اور بوقلمونی کا اظہار ہوتا ہے۔ میری
نظر میں اُن کا کالم اپنے رنگ و آہنگ اور ذائقے
میں جو امتیاز رکھتا ہے وہ معاصر کالم نگاروں سے یکسر
مختلف ہے۔
11 اپریل 2019

3۔عباس تابش کی رائے:

اردو کے مشہور شاعر اور صحافی عباس تابش نے محمد اظہار الحق کی کالم نگاری کے بارے میں میرے پوچھے گئے سوالوں کے جواب میں اپنی رائے کا اظہار کچھ یوں کیا۔

" محمد اظہار الحق صرف ایک صاحبِ طرز شاعر ہی نہیں بلکہ صاحبِ طرز نثر نگار بھی ہیں۔ محمد اظہار الحق اردو کالم نگاری کے میدان میں ایک رجحان ساز اور جدت پسند صحافی ہیں، انھوں نے عصرِ حاضر میں کالم نگاری کے میدان میں جو نیا راستہ بنایا ہے، اُس راستے پر جاوید چودھری سمیت کئی کالم نگار چلے اور سرخرو ٹھہرے"۔

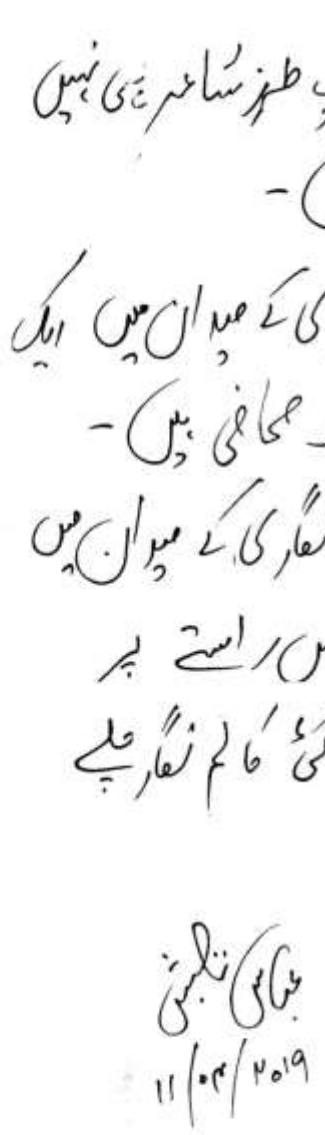

4۔کالم نگار اور شاعر ناصر محمود ملک کا محمد اظہار الحق کی کالم نگاری کے بارے میں جامع تبصرہ:

محمد اظہار الحق۔۔۔ ''اندازِ بیاں اور''

By Nasir Mehmood Malik

معروف انگلش شاعر و نقاد ایس ٹی کالرج نے شاعری کی تعریف کرتے ہوئے کہا تھا کہ بہترین الفاظ کو بہترین ترتیب میں رکھیں تو شاعری جنم لیتی ہے۔ دیکھا جائے تو چند دیگر خصوصیات کے ساتھ کالم نگاری کے لیے بھی یہی خوبیاں بنیادی شرائط کا درجہ رکھتی ہیں۔ ہمارے ہاں چند ایک کالم نگار جو کچھ دیگر محاسن کے ساتھ ان خوبیوں کا بہترین استعمال کر رہے ہیں ان میں محمد اظہار الحق صاحب سرِ فہرست ہیں۔ عمدہ کالم نگاری کی کوئی بھی ثقہ بند تعریف لے آیئے اظہار الحق صاحب کی کالم نگاری نہ صرف اس پر پورا اترتی ہے بلکہ اس تعریف کو مزید بہتر اور مکمل بھی کرتی ہے۔ مقصدیت، معنویت اور تاثیر سے مزیّن تحریر اظہار صاحب کی کالم نگاری کو کلاسیک کے درجے تک پہنچا رہی ہے۔

اظہار الحق صاحب قارئین کا ایک وسیع حلقہ رکھتے ہیں۔ ان کے پڑھنے والوں کو جو چیز زیادہ پسند ہے وہ ان کی تحریر کا ادبی انداز ہے۔ تحریر ایسی کہ تخلیق کے معیار پر پورا اترتی ہے۔ زبان اتنی پُختہ اور نثر اتنی عمدہ کہ رشک آتا ہے۔ اظہار صاحب خود ایک باکمال شاعر ہیں۔ چنانچہ ان کی نثر میں بھی شاعرانہ اسلوب در آتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے خوبصورت جُملے بسا اوقات کسی غزل کے مصرعے لگتے ہیں۔ میرؔ اور ناصرؔ کاظمی کے پڑھنے والے ان کی تحریر سے زیادہ لُطف اندوز ہوتے ہیں۔ تحریر میں بے ساختگی، ملائمت اور روانی حیران کُن ہوتی ہے۔ چنانچہ انہیں پڑھنا ایسے ہے، جیسے بہتے جھرنوں کا مشاہدہ۔۔ جیسے بادِ نسیم کے جھونکوں سے معانقہ!!

اظہار صاحب وسیع مطالعہ رکھتے ہیں۔ ان کی وسعتِ مطالعہ قابلِ رشک ہی نہیں قابلِ حسد بھی ہے۔ کلاسیک اور جدید، مقامی اور عالمی ادب پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ انتہائی اعلیٰ ذوق کے حامل ہیں۔ شاعری سے بے پناہ شغف ہے۔ اعلیٰ معیار کے ان گنت اشعار انہیں زبانی یاد ہیں۔ تحریر میں بر محل اشعار کا استعمال کوئی ان سے سیکھے۔ دینی، ادبی اور تاریخی کُتب کے مستند حوالے اور ان کے مصنفین کے خوبصورت تذکرے آپ کا طرّہ

امتیاز ہیں۔ مثالیں، واقعات اور تلمیحات آپ کی نثر کا مستقل زیور ہیں۔ نئے لکھنے والوں کے لیے تو آپ ایک ادارے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہمارے ہاں صاحبِ مطالعہ کالم نگاروں کی تعداد زیادہ نہیں ہے۔ زیادہ تر کالم نگار مطالعے کے لیے صرف اخبار و رسائل پر اکتفا کرتے ہیں۔ ٹی وی چینلز اور سوشل میڈیا بھی اب ان کے لیے علم کے ذرائع اور ماخذ بن چکے ہیں۔ بہت کم لوگ ہیں جو اب تک کتاب سے تعلق نبھا رہے ہیں۔ اور مطالعے کے شائق ان معدودے چند لوگوں میں سے ان کی تعداد تو مزید بھی کم ہے جو اپنے مطالعے سے کماحقہ استفادہ حاصل کرتے ہوئے اسے اپنی تحریر میں استعمال کرتے ہیں۔ بہت کم لوگ ہیں جن کی تحریر سے ان کے مطالعے کا پتہ چلتا ہے۔ دوسری طرف کئی بظاہر بہت پڑھے لکھے اور صاحبِ مطالعہ لوگوں کی تحریر گنجلک اور پیچیدہ ہوتی ہے۔ اُن کا مطالعہ اُن کی تحریر کی روانی کو متاثر کرتا ہے۔ ایسی مرصّع، مسجّع بھاری بھر کم نثر اُن کی تحریر کو ''باوزن '' تو بنا دیتی ہے لیکن وہ تاثیر سے عاری اور بوجھل ہو جاتی ہے۔ سو ! پتہ چلا کہ بے پناہ مطالعہ بھی اچھی نثر نگاری کو گارنٹی نہیں کرتا جب تک کہ آپ اس کا مناسب استعمال نہ جانتے ہوں۔ اظہار الحق صاحب اس حوالے سے منفرد ہیں۔ اُن کا وسیع مطالعہ اُن کے کالموں کا حُسن ہے۔۔ یہ اُن کی تحریر میں عُمدگی، شائستگی اور ملائمت پیدا کرتا ہے اور اسے شُستہ اور دلچسپ بناتا ہے۔ ایسے میں اُن کی فارسی دانی گویا غضب ڈھاتی ہے۔ فارسی اشعار اور مصرعوں کا بر موقع استعمال اُن کی تحریر کو چار چاند لگا دیتا ہے۔ اردو، فارسی اور انگلش ادب سے بے پناہ لگاؤ اُن کا اثاثہ ہے۔ اور اس پر مستزاد اُن کا وہ منفرد اندازِ بیاں ہے جو انہیں تمام ہم عصر کالم نگاروں سے ممتاز کرتا ہے۔۔۔ سیفؔ نے کہا تھا

سیفؔ اندازِ بیاں رنگ بدل دیتا ہے ورنہ دنیا میں کوئی بات نئی بات نہیں

اظہار الحق صاحب کے کالموں کی ایک اور خاص بات اُن کے موضوعات کا تنوع ہے۔ اُن کا کینوس بہت وسیع ہے۔ مذہبی مباحثے ہوں یا سیاسی مذاکرے، تاریخی حوالے ہوں یا شخصی تذکرے۔۔ انہیں ہر موضوع پر کمال دسترس حاصل ہے۔ انسانی رشتوں کی خوبصورتی کا بیان ہو یا پھر کسی ظالم کی بربریت اور درندگی کا احوال ۔۔ کسی فرشتہ صفت انسان کی بات ہو یا پھر انسانی بھیس میں کسی شیطان کا تذکرہ۔۔

غرض یہ کہ اک " Shoehorn " سے لے کر بین الاقوامی مسائل تک اظہار صاحب نے جس موضوع پر بھی لکھا حق ادا کر دیا۔۔ اُن کا کمال یہ ہے کہ وہ بظاہر عام اور معمولی سے موضوع کا انتخاب کرتے ہیں اور پھر اپنی مشّاقی سے اُسے شاہکار بنا دیتے ہیں۔ یوسفی صاحب نے عطاء الحق قاسمی صاحب کے بارے میں کہا تھا کہ اتنا لکھتے ہیں لیکن تازگی نہیں جاتی۔ اظہار صاحب کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ اتنا زیادہ لکھنے کے باوجود تحریر میں خوبصورتی اور دلچسپی ختم نہیں ہوتی۔

اظہار صاحب کا ''نسٹیلجیا'' اکثر اُن کے ساتھ رہتا ہے۔ گاؤں کی زندگی، اپنا بچپن، خالص خوراک، دادی اماں کے ہاتھ کے پراٹھے، بزرگوں کی باتیں۔۔ اُن کے خاص موضوعات ہیں۔ اور ان کا Treatment اتنا خوب صورت ہوتا ہے کہ پڑھتے ہوئے آنکھیں بھیگ جاتی ہیں۔ وہ حیران کُن مشاہدہ اور بلا کا حافظہ رکھتے ہیں۔ اُن کی منظر نگاری اور تصویر کشی ایک ماہر ادیب کا پتہ دیتی ہے۔ اُن کی تحریر سوچ کو تحریک دیتی ہے۔ میتھیو آرنلڈ نے عظیم انگریزی شاعر ولیم ورڈزورتھ کے بارے میں کہا تھا کہ بہت شاعر گزرے ہیں لیکن جس طرح ورڈز ورتھ ہمارے احساسات کو جگاتا ہے اس طرح کوئی اور نہیں کر سکا۔ اظہار صاحب کی تحریریں ہمارے تخیّل کو جلا بخشتی ہیں۔۔ ہمیں غور و فکر پہ آمادہ کرتی ہیں۔۔ یہ ہنر اور سلیقہ بھی کہیں اور نہیں ملتا۔

اظہار الحق صاحب ایک صاحبِ اسلوب شاعر اور بہترین کالم نگار ہی نہیں ایک شاندار انسان بھی ہیں۔۔ بڑے محبتی اور شفیق انسان۔۔ بچوں سے ان کی محبت اور اس کا اظہار عدیم المثال ہے۔ بے حد مہمان نواز اور کھانا کھلانے کے شوقین ہیں۔ انتہائی اعلیٰ درجے کے بیوروکریٹ رہے لیکن ان کی سادگی اور ملنساری قابلِ تقلید ہے۔ اُن کی گفتگو ایسی عمدہ اور دلچسپ ہوتی ہے کہ گھنٹوں پاس بیٹھے رہیں وقت کا پتہ نہیں چلتا۔ ایک امریکی مصنف کہتا ہے کہ کتابیں انسان کو تبدیل نہیں کرتیں لیکن ایک چھوٹا سا پیراگراف اور بعض اوقات محض ایک دو جُملے انسان کو بدل دیتے ہیں۔ اظہار صاحب ایسے ہی پیراگراف اور جُملے لکھتے ہیں جن سے پڑھنے والوں میں بڑے غیر محسوس لیکن مثبت انداز میں تبدیلی آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لاتعداد پڑھنے والے اُن کے کالم کا بڑی بیتابی سے انتظار کرتے ہیں۔۔ یہ ناچیز بھی اُن میں سے ایک ہے۔

بحوالہ "روزنامہ ڈان، تیرہ اپریل ۲۰۱۸ء"

نتائج

محمد اظہار الحق کی کالم نگاری کے حوالے سے اپنی اِس تحقیق کے نتیجے میں درج ذیل نتائج میرے سامنے آئے ہیں۔

- ۱۔ محمد اظہار الحق کے کالم سیاست، معاشرت، معیشت، ترقی پسندی، اخلاقیات اور مذہب کے گرد گھومتے ہیں اور اِن کالموں میں دلکش انفرادیت اور تازگی کا ایک جہان ملتا ہے نیز اردو، عربی اور فارسی میں خاص مہارت کی وجہ سے آپ کے کالموں میں ان تمام زبانوں کی ادبی چاشنی بھی جھلکتی ہے۔
- ۲۔ محمد اظہار الحق کی کالم نگاری کی اہم خوبی اپنی بات کو کہانی کے انداز میں دلچسپ پیرائے اور مؤثر طریقے سے کہنا، عام آدمی کے دکھ سکھ کو موضوع بنانا اور زندگی اور معاشرے کی تلخ حقیقتوں کو کھل کر بیان کرنا ہے، اُن کے کالم بہت سادہ اور عام فہم ہوتے ہیں۔
- ۳۔ محمد اظہار الحق چونکہ بنیادی طور پر ایک مذہبی گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں اِس لیے مذہب سے پیار اُن کی رگ رگ میں بسا ہوا ہے، اپنے مذہب سے اِس بے انتہا پیار کا اظہار وُہ اپنے کالموں میں کئی جگہ کرتے نظر آتے ہیں۔ انھوں نے کبھی اپنے ضمیر کے خلاف کچھ نہیں لکھا، انھوں نے جو کچھ سچ سمجھا، صرف وہی کچھ لکھا، چاہے وہ کتنا ہی تلخ کیوں نہ ہو، انھوں نے ہمیشہ قلم کی حرمت اور صحافت کے تقدس کا خاص خیال رکھا ہے۔
- ۴۔ محمد اظہار الحق کا اپنی جڑوں سے مضبوط رشتہ ہے اور اُن کا یہ خوبصورت اور اٹوٹ بندھن اُن کی کالم نگاری میں بخوبی نظر آتا ہے۔ محمد اظہار الحق کی کالم نگاری ہمیشہ امن، محبت اور رواداری کا پیغام دیتی ہے۔ وہ معاشرے کو ہر طرح کے استحصال سے پاک اور ہر سطح پر انصاف کی حکمرانی دیکھنا چاہتے ہیں۔
- ۵۔ محمد اظہار الحق کی کالم نگاری کی نمایاں خصوصیات میں سلاست، اختصار، مقصدیت، معنویت، جامعیت، رجائیت، تاثیر اور اخلاقی اقدار کا فروغ ہیں۔
- ۶۔ محمد اظہار الحق کی عام فہم نثر نے اردو صحافت کو نیا مقام عطا کرنے میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہے اور محمد اظہار الحق اردو کالم نگاری میں اپنے منفرد اظہار کے حوالے سے ایک جداگانہ اور برتر مقام کے حامل ہیں۔

سفارشات

- ۱۔ محمد اظہار الحق کی کالم نگاری کی فکری جہات کے مطالعے کے ساتھ ساتھ ان کے کالموں کا فنی، اسلوبیاتی اور تکنیکی جائزہ لینے کے لیے تحقیق کی جاسکتی ہے۔
- ۲۔ محمد اظہار الحق عصرِ حاضر کے نامور شاعر ہیں، اِس لیے اُن کے کالموں میں شاعرانہ اور صوفیانہ قدروں کے حوالے سے بھی تحقیق ہونی چاہیے۔
- ۳۔ محمد اظہار الحق کے کالموں کا معاصر کالم نگاروں کے کالموں کے ساتھ تقابلی جائزہ لینے کے لیے بھی تحقیق کی جاسکتی ہے۔
- ۴۔ محمد اظہار الحق کی کالم نگاری میں والدین سے محبت اور احترامِ والدین کا زیادہ ذکر ملتا ہے، اِس لیے اُن کی تحریروں کے حوالے سے اِس پہلو پر الگ سے تحقیقی کام ہونا چاہیے۔
- ۵۔ محمد اظہار الحق کی کالم نگاری مذہبی، تہذیبی، ثقافتی اور تاریخی حوالوں سے بھرپور ہے، لہٰذا اُن کی تحریروں کے حوالے سے اِن تمام جہات کے تناظر میں الگ سے تحقیق ہو سکتی ہے۔

کتابیات

بنیادی ماخذ :

"تلخ نوائی" (کالموں کا مجموعہ) محمد اظہار الحق، المیزان پبلشرز، الکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور، ۲۰۱۶ء

ثانوی ماخذ :

احمد رضا خان بریلوی، اعلیٰ حضرت، امام، کنز الایمان فی ترجمۃِ القرآن، اتفاق پبلشرز، عزیز مارکیٹ، اردو بازار لاہور، ۱۹۹۱ء

امام اعظم ڈاکٹر، اکیسویں صدی میں اردو صحافت، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۲۰۱۶ء

امداد صابری، مولانا، تاریخ صحافت اردو (جلد اوّل)، جدید پرنٹنگ پریس، دہلی، ۱۹۶۲ء

امداد صابری، مولانا، روحِ صحافت، مکتبہءِ شاہراہ اردو بازار، دہلی۔۶، ۱۹۶۸ء

انور علی دہلوی، (مرتب) اردو صحافت، اردو اکادمی، دہلی، ۱۹۸۷ء

جاوید چودھری، "زیرو پوائنٹ" عبداللہ اکیڈمی، لاہور، ۲۰۰۹ء

رحم علی الہاشمی، چودھری، فنِ صحافت، انجمن ترقی اردو ہند (دہلی) ۱۹۴۳ء

سیّد اقبال قادری، رہبر اخبار نویسی، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی (۶)، ۲۰۰۰ء

شفیق جالندھری، ڈاکٹر، اردو کالم نویسی، اے ون پبلشرز، الفضل مارکیٹ، اردو بازار لاہور، ۱۹۹۳ء

ظفر عالم ظفری، اردو صحافت میں طنز و مزاح، فیروز سنز، لاہور، ۱۹۹۶ء

عابد صدیقی، ادب اور صحافت، نیرنگ اکیڈمی، حیدر آباد، ۱۹۷۴ء

عبدالحئی، اردو صحافت اور سر سیّد احمد خان، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی (۶)، ۲۰۰۸ء

عبدالسلام خورشید، ڈاکٹر، کاروانِ صحافت انجمن ترقی اردو کراچی ۱۹۶۴ء

عبدالسلام خورشید، ڈاکٹر، اردو صحافت پاک و ہند میں، انجمن ترقی اردو، کراچی، ۱۹۶۶ء

عبدالغفار کوکب، فکاہیہ کالم نگاری، آغاز تا حال، اخبارِ جنگ

عدنان عادل، ٹیلی ویژن صحافت، انٹرنیشنل جرنلسٹ، کراچی، ۲۰۰۸ء

عمر زبیری، پروفیسر، قدیم تہذیبیں اور مذاہب، طیب شمشاد پرنٹرز، لاہور، ۲۰۱۲ء

محمد اسلم ڈوگر، فیچر، کالم، تبصرہ، مقتدرہ قومی زبان پطرس بخاری روڈ ایچ ایٹ فور اسلام آباد، ۱۹۹۸ء

محمد افتخار کھوکھر، تاریخِ صحافت، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد ۱۹۹۵ء

محمد حنیف شاہد، پروفیسر، اسلام اور قائداعظم، ٹیکنیکل پبلشرز، اردو بازار، لاہور، ۲۰۱۰ء

محمد شاہد حسین، پروفیسر، ابلاغیات، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۳ء

محمد عتیق صدیقی، ہندوستانی اخبار نویسی (کمپنی کے عہد میں) پبلی کیشنز فرید چیمبر عبداللہ ہارون روڈ، کراچی پاکستان، ۱۹۸۰ء

محمد فرقان سنبھلی، اردو صحافت اور ضلع مرادآباد، دیپا سرائے چوک، سنبھل، ضلع مرادآباد (یو۔پی) ۲۰۰۸ء

مسکین علی حجازی، ڈاکٹر، اداریہ نویسی، مرکزی اردو بورڈ، لاہور، ۱۹۷۰ء

مسکین علی حجازی، ڈاکٹر، پنجاب میں اردو صحافت کی تاریخ، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۹۷ء

مشتاق صدف، اردو صحافت، زبان، تکنیک، تناظر، سنگ میل روڈ، ایچ ایٹ فور، اسلام آباد

نورالحسن نیئر، مولانا، نورالغات (جلد دوم)، نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد، نیلاب پرنٹرز گوالمنڈی، راولپنڈی

وزیر آغا، ڈاکٹر، اردو ادب میں طنز و مزاح، مکتبہ عالیہ، اردو بازار، لاہور، ۱۹۹۳ء

اخبارات

۱۔روزنامہ ایکسپریس اسلام آباد(منتخب شمارے)

۲۔روزنامہ جنگ اسلام آباد(منتخب شمارے)

۳۔روزنامہ دنیااسلام آباد(منتخب شمارے)

۴۔روزنامہ نیوز ۱۹۲اسلام آباد(منتخب شمارے)

۵۔روزنامہ نوائے وقت اسلام آباد(منتخب شمارے)

٦. The Bangladesh Today Dhaka (Selected Newspapers)

۷. The News Islamabad (Selected Newspapers)

۸. The Age Melbourne, Australia (Selected Newspapers)

رسائل وجرائد

جوزف آرڈومینک،ڈائنامکس آف ماس کمیونیکیشن،میک گراہل پبلیکیشن،نیویارک،۱۹۹۲ء

The Science Of Political Economy by Henry George.

The Theory and Practice Of Banking 1883.

June-UNWTO-"Tourism Highlights-17 June 2012.

NWTO-World Tourism Barometer -" World's top destinations by international tourism receipts, 16 June 2012.

E.B Tylor researches into the development of mythology, Newyork, Gordon Philosophy religion art and custom. ISBN Press 1974.

NCSS Task Force on standards for teaching & learning in the social studies, 1993.

لغات

وارث سرہندی، قاموس مترادفات اردو سائنس بورڈ اپر مال لاہور1986ء

ڈاکٹر فہمیدہ بیگم مرتب فرہنگ اصطلاحات،انگریزی اردو Glossary of Technical Terms

ترقی اردو بیورو، دہلی، 1988ء (اشاعت اول)

محمد عبداللہ خان خویشگی مرتبہ فرہنگ عامرہ مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد 1989ء

مولوی فیروز الدین مرتبہ و مولفہ فیروز اللغات فیروز سنز لاہور 2001ء

خواجہ عبدالمجید مولفہ و مرتبہ جامع اللغات جلد دوم اردو سائنس بورڈ لاہور س۔ن

سید قائم رضا نسیم امروہوی، سید مرتضی حسین فاضل لکھنوی (اردو مترجمین) نسیم اللغات، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور س۔ن

Oxford Advanced Learner`s Dictionary of current English by A.S Hornby, Oxford University Press Great Claredon Street, oxford OX2 6DP Eight Edition, 2010.

Qoumi English Urdu Dictionary Edited by Dr. Jameel Jalbi.

انٹرنیٹ

The Encyclopaedia Britannica Volume III, 1973.

www.thefreedictionary.com

http://www.etymonline.com

hppt://dictionary.reference.com/browser/column

https://ur.m.wikipedia.org/wiki

www.rekhta.org

www.wikipedia.com

اشاریہ:

(موضوعات کی مناسبت سے منتخب شدہ کالم)

سیریل نمبر	موضوعات	متعلقہ منتخب کالم
۱	زبان و ادب	ابھی افق سلامت ہے، افتخار عارف کہاں ہے؟، فیبرک، ہماری آخری امید
۲	سیاست	پاندان کی فکر، دربارِ وطن میں جب ایک دن، انگریز کے اصل ذہنی غلام، کاش درمیان میں دیوار ہوتی، نندی پور! اے نندی پور، وہ جو دودھ سے بھری بالٹیاں گھروں کو لے گئے، شیر اور سرگوشی، دو تصویریں
۳	تاریخ	مہاتیر محمد، بلوچستان۔۔ اندھوں کے نرغے میں ہاتھی، شاہراہ اور پگڈنڈیاں، اسلم، جزیرہ اور املی کے بیج، ڈھاکہ ہم شرمندہ ہیں، ہرات، سقوطِ ڈھاکہ، تاشقند سے خوارزم اور ترمذ تک
۴	مذہب	بارہ ربیع الاول، شہر دلبر، واقعہ اور صاحبِ واقعہ، حدود کا تعین، ورفعنا لک ذکرک، بہ احترامِ فراواں، پیر، فقیر، اور اوراد و وظائف
۵	تہذیب، سماج اور ثقافت	پانچ بیماریاں، پہلا سورج، نیا سال، میں پرتھ یونیورسٹی سے متاثر کیوں نہیں ہوا، فحاشی کی تعریف، مگر اک بات جو دل میں تھی جس کا غم بہت ہے
۶	تعلیم، کھیل اور مفادِ عامہ	نظر نہ آنے والا نظام، کیا ہمارے ڈاکٹر، واہ پاکستان تیری بھی کیا قسمت ہے
۷	سائنس اور سیاحت	پہاڑ سر بن کا، احمقانہ سوالات، جب پتھر بولیں گے، جب پانی بھڑکے گا، ڈاکٹر، دوا اور لواحقین
۸	معیشت اور سماجیات	چراغ، نہیں ڈاکٹر قدیر خان صاحب نہیں، جن، کافر بھارت، ایک تصویر دیکھ کر، اِس عید پر، ایک عجیب غم، رخصتی

مقالہ نگار، کالم نگار کے ساتھ (انٹرویو کے موقع پر)

۲۹نومبر ۲۰۱۸ء